زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ

اشراق

جون 2025ء

مدیر: سید منظور الحسن

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۳ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۵ء ذوالحجہ ۱۴۴۶ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

زینتوں کی حلت — سید منظور الحسن — 3

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 272-286 (22) — جاوید احمد غامدی — 9

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 14

مقامات

عام اور خاص — جاوید احمد غامدی — 16

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (23) — سید منظور الحسن — 19

آثارِ صحابہ

حضرت علی سے متعلق سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر کے آثار (9) — ڈاکٹر عمار خان ناصر — 23

نقطۂ نظر

کلامِ رسول کا مطالعہ — محمد ذکوان ندوی — 38

کوفہ کا سیاسی کردار: ایک جائزہ (1) — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 41

شادی کے لیے بلوغت کی شرط — نعیم احمد بلوچ — 50

علامات قیامت اور تاریخی واقعات: بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (2) — محمد سعد سلیم — 63

مختارات

پہلے کون سی سورہ نازل ہوئی؟ — علامہ شبیر احمد ازہر / ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — 73

خاموش خدا، خاموش کلام — ثاقب علی — 88

مکالمات

مطالعۂ سنن ابن ماجہ (5) — ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن — 90

سیر و سوانح

حیاتِ امین (22) — نعیم احمد بلوچ — 101

ادبیات

اے کاش، کبھی سنتے معنی کی خبر لائی — جاوید احمد غامدی — 109

حالات و وقائع

خبر نامہ ”المورد امریکہ“ — شاہد محمود — 110

سید منظور الحسن

زینتوں کی حلت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حس جمالیات سے فیض یاب کرنے کے ساتھ اُس کی تسکین کے اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ یہ اسباب انفس و آفاق، دونوں میں ودیعت ہیں۔ انسان اپنے حسن نظر، حسن بیان اور حسن صوت و سماعت کی بنا پر اِنھیں بروے کار لاتا اور لطف و نشاط کا سامان کرتا ہے۔ بدن کی آرایش، گھر کی زیبایش، ماحول کی تزئین، گفتگو کی لطافت، کلام کی غنائیت، آواز کا ترنم، اِسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اِن کی حقیقت اللہ کی زینتوں کی ہے، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ یہ اللہ کی نعمتیں ہیں اور ہر لحاظ سے جائز اور حلال ہیں۔ قرآنِ مجید نے اِن پر نہ کوئی پابندی عائد کی ہے اور نہ اِن سے بے اعتنائی کی ترغیب دی ہے۔ اِس کے برعکس، اُن مذہبی پیشواؤں کو تنبیہ فرمائی ہے، جو اِنھیں حرام قرار دے کر لوگوں کو اِن سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اِس تنبیہ کے ساتھ اللہ نے وہ اصولی رہنمائی بھی ارشاد فرمائی ہے، جس پر اسبابِ حسن و جمال کے حلال و حرام کا انحصار ہے۔ یہ تنبیہ و تہدید اور اصولی رہنمائی سورۂ اعراف (7) کی آیات 28 تا 32 میں مذکور ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا ”یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا

عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۟ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ. فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ.

ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اِسی طریقے پر پایا ہے اور خدا نے ہمیں اِسی کا حکم دیا ہے۔ اِن سے کہو، اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر افترا کر کے ایسی باتیں کہتے ہو، جنھیں تم نہیں جانتے؟ اِن سے کہو، میرے پروردگار نے (ہر معاملے میں) راستی کا حکم دیا ہے۔ اُس نے فرمایا ہے کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رخ اُسی کی طرف کرو اور اطاعت کو اُس کے لیے خالص رکھ کر اُسی کو پکارو۔ تم (اُس کی طرف) اُسی طرح لوٹو گے، جس طرح اُس نے تمھاری ابتدا کی تھی۔ ایک گروہ کو اُس نے ہدایت بخشی، (وہ اِن سب باتوں کو مانتا ہے) اور ایک گروہ پر گم راہی مسلط ہو گئی، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے یہ ہیں کہ راہ ہدایت پر ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنی زینت کے ساتھ آؤ، اور کھاؤ پیو، مگر حد سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اِن سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر

خَالِصَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ.

دیا، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھیرایا ہے؟ اِن سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں کوئی حصہ نہ ہو گا)۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔"

کلام کے آغاز میں مشرکین کے اُن کاموں کی شناعت واضح کی ہے، جو وہ مذہب کے نام پر کرتے تھے۔ اِس میں سب سے نمایاں کام بیت اللہ کا برہنہ طواف تھا۔ مرد اور عورتیں، دونوں عبادت کی آڑ میں اِس عریانی کا ارتکاب کرتے تھے۔ بدن کی زینت — لباس — کو اتارنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ دلیل یہ تھی کہ یہ دنیاداری کی آلایش ہے، اِس لیے اِس سے پاک ہو کر بیت اللہ میں داخل ہونا چاہیے۔ بے حیائی کے اِس ناپاک کام کو اللہ کے حکم اور اپنے آبا و اجداد کی سنت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ استاذِ گرامی نے آیت کے لفظ 'فَاحِشَة' کی وضاحت میں مشرکین کے اِس عمل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اصل میں لفظ 'فَاحِشَة' استعمال ہوا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس سے بے حیائی کے اُن کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو مذہب کے نام پر کیے جاتے تھے۔ اِس طرح کی چیزیں مشرکین کے معبدوں اور صوفیانہ مذاہب کی درگاہوں اور عبادت گاہوں میں عام رہی ہیں۔ یہ پروہتوں، پجاریوں اور مجاوروں کی شیطنت سے وجود میں آتی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلی میں بھی اِسی نوعیت کی ایک بدعت بیت اللہ کے برہنہ طواف کی رائج تھی۔ لوگ اِسے مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اُنھیں خدا نے اِس کا

حکم دیا ہے۔ قریش بیت اللہ کے پروہت تھے اور اُنھوں نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ اُن سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں کعبے کا طواف نہیں کر سکتے۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ یا قریش میں سے کسی سے اِس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں یا ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے ایسی آلایش ہیں جن کے ساتھ یہ غیر معمولی عبادت نہیں ہو سکتی۔'' (البیان 2/144)

اللہ تعالیٰ نے اِس بے حیائی کی اپنی طرف نسبت کی سختی سے تردید فرمائی ہے اور پوری تنبیہ و تہدید کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ پر ایسی بے سند اور بے دلیل بات کی تہمت کیوں لگاتے ہو؟

اِس پس منظر میں حکم فرمایا ہے کہ اللہ کی عبادت گاہ میں آنے کے لیے بدن کی زینت، یعنی لباس سے آراستہ ہو کر آؤ۔ گویا اِس معاملے میں نہ بے حیائی کی کوئی گنجایش ہے کہ برہنہ ہو جاؤ اور نہ رہبانیت کی کہ اِس بد ذوقی اور بے زینتی کو اللہ سے منسوب کرنے لگو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے عبادت کے لیے کوئی خاص وضع قطع یا کوئی مخصوص تعظیمی لباس مقرر نہیں فرمایا۔ مسجدِ حرام یا کسی اور مسجد کے لیے کوئی رسمی لباس (dress code) بھی طے نہیں کیا۔ جو لباس لوگ عام طور پر پہنتے ہیں، اُسی کو پہن کر آنے کی ہدایت ہے۔[1] مزید واضح فرمایا ہے کہ بدن کی زینت کے ساتھ غذا کی زینت پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یعنی خور و نوش کے جو طیبات زندگی کی سلامتی اور لذتِ کام و دہن کے لیے گھر در میں استعمال کرتے ہو، وہ مسجدوں میں بھی استعمال کر سکتے ہو۔ جس طرح لباس دین داری کے خلاف نہیں ہے، اُسی طرح کھانے پینے میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دین داری کے خلاف نہیں ہے۔

اِس معاملے میں جو ممانعت ہے، وہ اسراف کی ہے۔ —— اللہ کی نعمتوں کے معاملے میں عدل و قسط پر قائم نہ رہتے ہوئے حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا اسراف ہے۔ —— چنانچہ جس طرح اللہ کی نعمتوں سے بے پروائی برتنا غیر اخلاقی رویہ ہے، اُسی طرح اُنھیں فضول طریقے سے ضائع کر دینا بھی خلافِ اخلاق ہے۔ نعمت کو مسترد کرنا یا اُس کا بے مصرف استعمال کرنا، دونوں رویے نعمت کی ناقدری کا اظہار ہیں۔ فیضانِ الٰہی کے بارے میں ایسی بد تہذیبی اور ایسی بے باکی کو ہرگز گوارا نہیں

---

[1] ۔ حج و عمرہ کے موقع پر، البتہ احرام باندھنا ضروری ہے۔ اِس کا مقصد اِن عبادات میں مطلوب سادگی اور درویشی کا اظہار ہے۔

کیا جا سکتا۔ اللہ کا دین فطرت کے توازن پر قائم ہے، لہٰذا وہ اِس معاملے میں کسی عدم توازن اور کسی افراط و تفریط کو تزکیۂ نفس کے خلاف ہونے کی وجہ سے رد کرتا ہے۔ امام امین احسن اصلاحی اِس امر کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”... اللہ تعالیٰ 'قَایِمٌ بِالْقِسْطِ' ہے۔ اِس وجہ سے وہ 'مُقْسِطِیْن'، یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مُسْرِفِیْن'، یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی کو مقصود بنا لے اور رات دن اِسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اِن چیزوں کو راہبوں اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط، دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔“

(تدبر قرآن 3/ 251-252)

مسجدوں میں حاضری کی باطل اور خود ساختہ پابندیوں کی تردید کے بعد آیت 32 میں زینت کی تمام چیزوں کے بارے میں اصولی ہدایت ارشاد فرمائی ہے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت حلال و حرام کے بارے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس میں واضح کر دیا ہے کہ کسی چیز کو حرام قرار دینا کس کا حق ہے اور زینتوں کے بارے میں اُس کا اصولی حکم کیا ہے؟ ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ.

”اِن سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھیرایا ہے؟ اِن سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی

کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں
کوئی حصہ نہ ہو گا)۔ ہم اُن لوگوں کے
لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اِسی
طرح تفصیل کرتے ہیں۔‘‘

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(22)

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

(بنی اسرائیل نہیں مانتے تو اے پیغمبر)، اِن کو ہدایت پر لے آنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت دیتا ہے۔ (ایمان والو، تم البتہ سمجھ لو کہ) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، اُس کا نفع تمھیں ہی ملنا ہے، اور تم اِسی لیے تو خرچ کر رہے ہو کہ

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾ یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

اللہ کی رضا حاصل ہو، اور (اِس مقصد سے) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، وہ (قیامت میں) تمھیں پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے حق میں ذرا بھی کمی نہ ہو گی۔272

یہ خاص کر اُن غریبوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، (اپنے کاروبار کے لیے) زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، اُن کی خودداری کے باعث ناواقف اُن کو غنی خیال کرتا ہے، اُن کے چہروں سے تم اُنھیں پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ (اُن کی مدد کرو) اور (سمجھ لو کہ اِس مقصد کے لیے) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، اُس کا صلہ تمھیں لازماً ملے گا، اِس لیے کہ اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ جو لوگ شب و روز، علانیہ اور چھپا کر اپنا مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اُن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہاں اُن کے لیے کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔273-274

اِس کے برخلاف جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت میں اٹھیں گے تو بالکل اُس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اِس لیے کہ اُنھوں نے کہا ہے کہ بیع بھی تو آخر سود ہی کی طرح ہے اور تعجب ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرایا ہے۔ (اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے اُسے حرام ٹھیرایا ہے)، لہٰذا جسے اُس کے پروردگار کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا، سو لے چکا، (اُس کے خلاف کوئی اقدام نہ ہو گا) اور اُس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) اِس کا اعادہ کریں گے تو وہ دوزخ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْـَٔـــُٔوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۭ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اُس دن) اللہ سود کو مٹادے گا اور خیرات کو بڑھائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی ناشکرے اور کسی حق تلفی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ہاں، جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے اور نماز کا اہتمام کیا اور زکوٰۃ ادا کی، اُن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہاں اُن کے لیے کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ وہ کوئی غم کبھی کھائیں گے۔ 275-277

ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جتنا سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ، اور اگر توبہ کر لو تو تمھاری اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے، نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ اور مقروض کبھی تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو اور اگر تم بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو۔ اور اُس دن سے ڈرو، جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی وہاں پوری مل جائے گی اور لوگوں پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ 278-281

ایمان والو، (قرض کے معاملات، البتہ ہوں گے۔ لہٰذا) تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لو اور چاہیے کہ اُس کو تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو، وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے، وہ بھی دوسروں کے لیے لکھ دے۔ اور یہ دستاویز اُسے لکھوانی چاہیے جس پر حق عائد ہوتا ہو۔ اور وہ

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۳﴾

لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۸۴﴾

اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرے اور اُس میں کوئی کمی نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اُس کے ولی کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور تم اِس پر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی گواہی کرا لو، لیکن اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تمھارے پسندیدہ گواہوں میں سے۔ دو عورتیں اِس لیے کہ اگر ایک الجھے گی تو دوسری اُس کو یاد دلا دے گی۔ اور یہ گواہ جب بلائے جائیں تو اُنھیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اُس کے وعدے تک اُسے لکھنے میں اکتایا نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اِس سے تمھارے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر لین دین روبرو اور دست گرداں نوعیت کا ہو، تب اُس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور سودا کرتے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو، اور (متنبہ رہو کہ) لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے، اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ وہ گناہ ہے جو تمھارے ساتھ چپک جائے گا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور (اِس بات کو سمجھو کہ) اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ 282

اور اگر تم سفر میں ہو اور تمھیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسے کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس (رہن کی وہ چیز) امانت رکھی گئی ہے، وہ یہ امانت واپس کر دے اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے (اور اِس معاملے پر گواہی کرا لے)، اور گواہی (جس صورت میں بھی ہو، اُس) کو ہرگز نہ چھپاؤ اور (یاد رکھو کہ) جو اُسے چھپائے گا، اُس کا دل گناہ گار ہو گا، اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔ 283

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے، (اِس لیے، تم بھی اے بنی اسرائیل، ایک

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ڰ وَاغْفِرْ لَنَا ڰ وَارْحَمْنَا ڰ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۸۶

دن اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اُسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ اُس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔284

(تم نہیں مانتے تو اِس کا نتیجہ بھی تمھیں ہی دیکھنا ہے)۔ ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے۔——یہ حقیقت ہے کہ اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (اُس کا قانون ہے کہ) اُسی کو ملے گا جو اُس نے کمایا ہے اور وہی بھرے گا جو اُس نے کیا ہے——پروردگار، ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو اُس پر ہماری گرفت نہ کر۔ اور پروردگار، تو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا۔ اور پروردگار، کوئی ایسا بوجھ جس کو ہم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے، تو ہم سے نہ اٹھوا، اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا آقا ہے، سو اِن منکروں کے مقابلے میں (جو ہمارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں)، تو ہماری مدد کر۔285-286

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

ابو بردہ اپنے والد عبد اللہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت (جس میں میری بعثت ہوئی)، وہ امت ہے کہ اِس پر بڑی رحمت ہوئی ہے۔ اِس پر عذاب اِنھی کے ہاتھوں سے آئے گا۔ (پھر) جب قیامت کا دن ہو گا تو وہاں بھی اِن کے اہل ذمہ یا اہل شرک میں سے ہر شخص کو اِنھی میں سے کسی کے حوالے کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ جہنم سے تمھارا فدیہ ہے۔ (مسند عبد بن حمید، رقم 545)

—2 —

عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: لوگو، سنو، میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ آج جو باتیں اُس نے مجھے سکھائی ہیں اور جن سے تم ناواقف ہو، وہ میں تمھیں سکھا دوں۔ میرے رب نے فرمایا ہے کہ ہر وہ مال جو میں نے اپنے کسی بندے کو دے دیا ہے، وہ اُس کے لیے حلال ہے۔ اور میں نے اپنے سب بندوں کو حق کی طرف رجوع کرنے والا بنا کر پیدا کیا ہے، لیکن پھر شیاطین نے اُن کے پاس آ کر اُن کے دین سے اُنھیں پھیر دیا۔ اور میں نے اپنے بندوں کے لیے جن چیزوں کو حلال کیا ہے، اُنھوں نے وہ اُن کے لیے حرام کر دیں اور اُن کو ترغیب دی کہ میرے ساتھ اُن کو شریک

ٹھیرائیں جن کے لیے میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور ترغیب دی کہ میری بنائی ہوئی ساخت کو تبدیل کر دیں۔ اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر ڈالی تو اہل کتاب کے کچھ بچے ہوئے لوگوں کے سوا وہ اُن کے سب عرب و عجم سے ناراض ہوا اور فرمایا: اے محمد، میں نے تمھیں اِس لیے بھیجا ہے کہ تم کو آزماؤں اور تمھارے ذریعے سے دوسروں کو بھی آزماؤں۔ اور میں نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے کوئی پانی نہیں دھو سکے گا اور تم سوتے جاگتے اِس کتاب کو پڑھو گے، اور کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قریش کو جلاڈالوں۔ اِس پر میں نے عرض کیا کہ پروردگار، میں یہ کروں تو قریش کے لوگ تو میرا سر پھاڑ کر اُسے کھائی ہوئی روٹی بنا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اُن کو نکلنے کے لیے کہنا، جس طرح اُنھوں نے تمھیں نکلنے کے لیے کہا ہے اور اُن سے جنگ کرنا، ہم بھی تمھارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے اور تم اپنے مجاہدین پر خرچ کرنا، عنقریب ہم بھی تم پر عنایت فرمائیں گے، اور اپنا لشکر روانہ کرنا، ہم اُس کے ساتھ پانچ گنا لشکر مزید روانہ کر دیں گے، اور تم یہ قتال اپنے فرماں برداروں کو لے کر اُن کے ذریعے سے اپنے نافرمانوں کے ساتھ کرنا۔ (مسلم، رقم 5113)

— 3 —

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے قیامت سے پہلے تلوار دے کر بھیجا گیا ہے، (میں اِس کے ذریعے سے لڑوں گا)، یہاں تک کہ (اِس سرزمین میں) تنہا ایک خدا کی عبادت کی جائے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے میرا رزق میرے نیزے کے سایے میں رکھ دیا ہے اور جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے، اُس کے لیے ذلت اور محکومی کا فیصلہ فرمایا ہے۔ (یاد رکھو)، جو کسی قوم کی طرح ہو کر رہے گا، وہ پھر اُنھی میں شمار ہو گا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 18833)

جاوید احمد غامدی

عام اور خاص

دنیا کی کسی زبان میں بھی یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہر لفظ ایک معنی اور ہر اسلوب ایک ہی مدعا کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ یہ بالعموم متعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کہ کسی کلام میں یہ کس مفہوم کے لیے استعمال ہوئے ہیں، ہمیشہ اِسی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ جملے کی تالیف، متکلم کا عرف، نظم کلام، سیاق و سباق اور اِس نوعیت کے بعض دوسرے قرائن کیا حکم لگاتے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ذہن تمام احتمالات کو سامنے رکھ کر کبھی فکر و تدبر کے بعد اور کبھی بادنیٰ تامل اپنا فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ زبان سے متعلق یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر امام شافعی نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں قرآن کے خاص و عام سے متعلق فرمایا ہے کہ زبان محتمل المعانی ہوتی ہے۔ اُس کے خاص و عام بھی جب کسی کلام کا جزو بن کر آتے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں اُسی معنی کے لیے آئیں جس کے لیے وہ اصلاً وضع کیے گئے ہیں۔ اللہ کی کتاب اِس طرح نازل ہوئی ہے کہ اُس میں لفظ عام ہوتا ہے، مگر اُس سے خاص مراد لیا جاتا ہے اور خاص ہوتا ہے، مگر اُس سے عام مراد لیا جاتا ہے۔ * لہٰذا نہ خاص کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مدلول کے لیے قطعی

---

* الرسالہ، الشافعی 230۔ یہی وہ بات ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ امام

ہے اور نہ عام کے بارے میں کہ وہ اپنے تحت تمام افراد پر لازماً دلالت کرے گا۔ ائمۂ اصول کے ایک گروہ کو اِس سے اختلاف ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اِس معاملے میں امام شافعی کا نقطۂ نظر ہی صحیح ہے، اِس لیے کہ یہ مجرد لفظ نہیں، بلکہ اُس کا موقع استعمال ہے جو سامع یا قاری کو اُس کے مفہوم سے متعلق کسی حتمی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں لکھا ہے:

''... قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر الفاظ عام ہیں، لیکن سیاق و سباق کی دلالت پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ اُن سے مراد عام نہیں ہے۔ قرآن 'النَّاس' کہتا ہے، لیکن ساری دنیا کا تو کیا ذکر، بارہا اِس سے عرب کے سب لوگ بھی اُس کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ وہ 'عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ' کی تعبیر اختیار کرتا ہے، لیکن اِس سے دنیا کے سب ادیان مراد نہیں لیتا۔ وہ 'الْمُشْرِکُوْن' کا لفظ استعمال کرتا ہے، لیکن اِسے سب شرک کرنے والوں کے معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ وہ 'اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ' کے الفاظ لاتا ہے، لیکن اِس سے پورے عالم کے اہل کتاب مراد نہیں ہوتے۔ وہ 'الْاِنْسَان' کے لفظ سے اپنا مدعا بیان کرتا ہے، لیکن اِس سے ساری اولاد آدم کا ذکر مقصود نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کا عام اسلوب ہے، جس کی رعایت اگر ملحوظ نہ رہے تو قرآن کی شرح و وضاحت میں متکلم کا منشا بالکل باطل ہو کر رہ جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، لہٰذا ناگزیر ہے کہ اِس معاملے میں قرآن کے عرف اور اُس کے سیاق و سباق کی حکومت اُس کے الفاظ پر ہر حال میں قائم رکھی جائے۔''(23)

زبان کی یہی نوعیت ہے جس کے پیش نظر قرآن کے علما و محققین تقاضا کرتے ہیں کہ متکلم کے منشا تک پہنچنا ہو تو محض ظاہر الفاظ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اُن کے باطن کو سمجھ کر حکم لگانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الٰہی کی یہی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ارشادات سے اُن مضمرات و تضمنات کو واضح کر دیا ہے جن تک رسائی اُن لوگوں کے لیے مشکل ہو سکتی تھی جو

شافعی بھی الفاظ کی دلالت کو اُن کے معانی پر ظنی مانتے ہیں، دراں حالیکہ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زبان میں ایک سے زیادہ مفاہیم کا احتمال ہوتا ہے، اِس لیے کسی ایک احتمال کو سامنے رکھ کر فیصلہ سنانے کے لیے مبادرت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ تدبر کے ساتھ دیکھنا چاہیے کہ کسی خاص موقع پر کون سا مفہوم ہے جسے متکلم کا منشا قرار دیا جا سکتا ہے۔

لفظ و معنی کی اِن نزاکتوں کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ امام شافعی بجا طور پر اصرار کرتے ہیں کہ ظاہر الفاظ کی بنیاد پر آپ کی اِس تفہیم و تبیین سے صرف نظر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قرآن کا بیان ہے، اِس میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہیں ہوتی۔ خدا کا پیغمبر کتاب الٰہی کا تابع ہے۔ وہ اُس کے مدعا کی تبیین کرتا ہے، اُس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ امام اپنی کتاب میں اِس کی مثالیں دیتے اور بار بار متنبہ کرتے ہیں کہ قرآن کے احکام سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ بیان اور صرف بیان ہے۔ اُسے نہیں مانا جائے گا تو یہ قرآن کی پیروی نہیں، اُس کے حکم سے انحراف ہو گا، اِس لیے کہ اُس کا متکلم وہی چاہتا ہے جو پیغمبر کی تفہیم و تبیین سے واضح ہو رہا ہے، اُس کا منشا اُس سے مختلف نہیں ہے۔

امام شافعی کی اِس بات سے زیادہ سچی بات کیا ہو سکتی ہے! لیکن امام کے استدلال کی کم زوری یہ ہے کہ بیش تر موقعوں پر وہ مبرہن نہیں کر سکے کہ لفظ اور معنی کے جس تعلق کو وہ بیان سے تعبیر کرتے ہیں، وہ اُن میں پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کی چند ایسی روایتوں پر بھی مطمئن ہو گئے ہیں جنھیں کسی طرح بیان قرار نہیں دیا جا سکتا، دراں حالیکہ اُن کے بارے میں یہ بحث ہو سکتی تھی کہ اُن کے راویوں نے آپ کا مدعا ٹھیک طریقے سے سمجھا اور بیان بھی کیا ہے یا نہیں؟ امام شافعی کے نقطۂ نظر سے جو لوگ اختلاف کرتے ہیں، اُن کی اصلی الجھن یہی ہے۔

ہم نے ”میزان“ میں کوشش کی ہے کہ امام کے موقف کو پوری طرح مبرہن کر دیں، اِس لیے کہ اصولاً وہ بالکل صحیح ہے۔ اہل نظر ”میزان“ کے مقدمہ ”اصول و مبادی“ میں ”میزان اور فرقان“ کے زیر عنوان یہ مباحث دیکھ سکتے ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن مجید کے احکام سے متعلق روایتوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اُس کے الفاظ کا مضمر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریحات سے ظاہر کر دیا ہے۔ قرآن کے طالب علموں کو اِس سے لفظ کے باطن میں اتر کر اُس کو سمجھنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے، اِسے رد کر دینے یا اِس سے قرآن کے نسخ پر استدلال کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔

[2011ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(23)

لفظ 'آیۃ' کے مختلف مصداقات: ایک اشکال کی وضاحت

اِس تالیف کا ابتدائی باب "آیۃ کا مفہوم و مصداق" کے زیرِ عنوان ہے۔ اُس میں بیان ہوا ہے کہ 'آیۃ' کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ بہ طورِ اصطلاح آیا ہے اور چار مختلف اطلاقات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کسی مقام پر اِن چار اطلاقات میں سے کون سا اطلاق صادق آتا ہے، اِس کا تعین کلام کرتا ہے۔ اِس بات پر بادی النظر میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لفظ چار مختلف مصداقات کا حامل ہو، وہ چاروں ایک ہی کلام میں استعمال ہوئے ہوں اور اِن میں تفریق کرنا بھی ممکن ہو؟

ہمارے نزدیک کسی لفظ کا ایک سے زیادہ مفاہیم اور اطلاقات کے لیے استعمال ہو جانا زبان و بیان کا عام اسلوب ہے۔ قرآنِ مجید سے اِس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اِن میں سے ایک

معروف اور عام فہم مثال لفظِ ”ذکر“ کی ہے۔ یہ لفظ کئی مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر:

1۔ سورۂ بقرہ میں یہ یاد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ بنی اسرائیل کو فرمایا ہے:

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ. (40:2)

”(قرآن تمھارے لیے یہی ہدایت لے کر آیا ہے، اِس لیے) اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تم پر کی تھی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔“

2۔ سورۂ مائدہ میں یہی لفظ زبان سے نام لینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمۡ ؕ قُلۡ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ مُکَلِّبِیۡنَ تُعَلِّمُوۡنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ.

”وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لیے کیا چیز حلال ٹھیرائی گئی ہے؟ کہہ دو: تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے شکار پر دوڑانے کے لیے سدھا لیا ہے، جنھیں تم اُس علم میں سے کچھ سکھا کر سدھاتے ہو، جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے، (اُن کا کیا ہوا شکار بھی حلال ہے)۔

فَکُلُوۡا مِمَّاۤ اَمۡسَکۡنَ عَلَیۡکُمۡ وَ اذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَیۡهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ. (4:5)

اِس لیے جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں، اُس میں سے کھاؤ اور (جانور کو شکار پر چھوڑنے سے پہلے) اُس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔“

3۔ آلِ عمران میں یہ لفظ اِس طرح آیا ہے کہ دل کی یاد اور زبان کا اظہار، دونوں کو شامل

ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ. الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ....
(191-190:3)

”(یہ عقل کے اندھے ہیں، اِس لیے پیغمبر پر ایمان کے لیے نشانی مانگتے ہیں، ورنہ) حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کے بنانے میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو بصیرت والے ہیں۔ اُن کے لیے جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور زمین اور آسمانوں کی خِلقت میں غور کرتے رہتے ہیں...۔“

4۔ سورۂ انبیاء میں یہ کسی کے بارے میں عام ذکر کرنے یا بات کرنے کے معنی میں مذکور ہے:

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ ھٰذَا بِاٰلِھَتِنَآ اِنَّہٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ. قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ یُقَالُ لَہٗٓ اِبْرٰھِیْمُ.
(60-59:21)

”(اُنھوں نے آ کر بتوں کی یہ حالت دیکھی تو) کہنے لگے: ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ یقیناً وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک نوجوان کو اِنھیں کچھ برا کہتے ہوئے سنا تھا، جس کو ابراہیم پکارتے ہیں۔“

5۔ سورۂ احزاب میں بیان کرنے اور چرچا کرنے کے مفہوم میں آیا ہے:

وَ اذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا.(34:33)

”اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور اُس کی حکمت کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اُس کا چرچا کرو۔ بے شک، اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔“

6۔ سورۂ مائدہ میں یہ لفظ یاددہانی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ....(14:5)

”اِسی طرح ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا، جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ پھر جس چیز کے ذریعے سے اُنھیں یاددہانی کی گئی، اُس کا ایک حصہ وہ بھی بھلا بیٹھے....“

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

حضرت علی سے متعلق
سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر کے آثار

(9)

(1)

عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: بَيْنَمَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ جَالِسًا مَعَ أَصْحَابِهِ، إِذْ جَاءَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ فَلَمْ يَجِدْ مَجْلِسًا، فَتَزَحْزَحَ لَهُ أَبُو بَكْرٍ ثُمَّ أَجْلَسَهُ إِلَى جَنْبِهِ، فَسُرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ بِمَا صَنَعَ ثُمَّ قَالَ: أَهْلُ الْفَضْلِ أَوْلَى بِالْفَضْلِ، وَلَا يَعْرِفُ لِأَهْلِ الْفَضْلِ فَضْلَهُمْ إِلَّا أَهْلُ الْفَضْلِ.

(فضائل الصحابۃ، ابن حنبل، رقم 1098)

”حسن بصری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ علی بن ابی طالب وہاں آئے، لیکن بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ پائی۔ اس پر ابو بکر اپنی جگہ سے کچھ ہٹے اور علی کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل دیکھ کر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ فضیلت والے کام ارباب فضیلت کو ہی جچتے ہیں، اور اہل فضیلت کی فضیلت کو بھی وہی پہچانتے ہیں جو خود اہل فضیلت ہوں۔"

لغوی تشریح

تَزَحْزَحَ، یعنی اپنی جگہ سے کچھ ہٹ گئے اور سیدنا علی کے بیٹھنے کے لیے گنجایش پیدا کی۔

تخریج اور اختلاف طرق

حسن بصری کا مذکورہ طریق مرسل ہے اور اس سند سے یہ "فضائل الصحابۃ" لابن حنبل میں ہی منقول ہے۔

اس کے علاوہ، درج ذیل مصادر میں یہ واقعہ سیدنا انس کی روایت سے بھی مروی ہے:

تاریخ دمشق، ابن عساکر 42/356۔ معجم ابن الاعرابی، رقم 141، 555۔ مسند الشہاب القضاعی، رقم 1164۔ تاریخ بغداد، خطیب 3/105، 7/222۔ الفوائد المنتقاۃ الحسان، خلعی، رقم 347۔

تاہم اس کی سند میں محمد بن زکریا الغلابی، احمد بن نصر الذارع اور عباس بن بکار جیسے انتہائی مجروح راویوں کی موجودگی کی وجہ سے محدثین نے اس واقعے کو موضوع روایات میں شمار کیا ہے۔ (ابن الجوزی، الموضوعات 1/380۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ 11/95۔ الشوکانی، الفوائد المجموعۃ 1/371۔ الالبانی، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ 7/213، رقم 3227) دیلمی نے اسے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے طریق سے بیان کیا ہے، لیکن اس کی سند میں بھی مجروح راوی موجود ہیں (ابن عراق، تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ 1/359)۔

البتہ سخاوی لکھتے ہیں کہ سنداً ضعیف ہونے کے باوجود اس کے مضمون میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں (المقاصد الحسنۃ 1/185)۔ اسی پہلو سے بعض اہل علم نے اس اثر سے آداب مجلس اور سیدنا علی کی تعظیم و تفضیل کی بحث میں استشہاد بھی کیا ہے (دیکھیے: احکام القرآن، ابن العربی 4/199)۔ متن میں امام احمد کی "فضائل الصحابۃ" سے جو مرسل روایت نقل کی گئی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کی اصل موجود ہے۔

(2)

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ فِي سَفَرٍ، فَنَزَلْنَا بِغَدِيرِ خُمٍّ، فَنُودِيَ فِينَا: الصَّلَاةُ جَامِعَةٌ، وَكُسِحَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ تَحْتَ شَجَرَتَيْنِ، فَصَلَّى الظُّهْرَ، وَأَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ، فَقَالَ: أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنِّي أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنِّي أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: فَأَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ، فَقَالَ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ، اللهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ. قَالَ: فَلَقِيَهُ عُمَرُ بَعْدَ ذَلِكَ، فَقَالَ لَهُ: هَنِيئًا يَا ابْنَ أَبِي طَالِبٍ، أَصْبَحْتَ وَأَمْسَيْتَ مَوْلَى كُلِّ مُؤْمِنٍ، وَمُؤْمِنَةٍ. (مسند احمد، رقم 18479)

”براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ راستے میں ہم مقام خم پر ایک حوض پر ٹھہرے۔ باجماعت نماز کے لیے اذان دی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک درخت کے نیچے جگہ صاف کی گئی اور آپ نے نماز ظہر ادا فرمائی۔ پھر آپ نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور (لوگوں سے مخاطب ہو کر) کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میرا مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بالکل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میرا ہر ہر مومن پر اس کی جان سے بھی زیادہ حق ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بالکل ہے۔ اس پر آپ نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں، علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اے اللہ، جو اس کے ساتھ محبت کا تعلق رکھے، اس کے ساتھ تو بھی محبت کا تعلق رکھ اور جو اس کے ساتھ مخاصمت کرے، تو بھی اس کے ساتھ مخاصمت کر۔ براء کہتے ہیں کہ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا کہ اے ابن ابی طالب، تمھیں مبارک باد ہو، تم ہر مومن مرد اور عورت کے مولیٰ قرار پا گئے ہو۔“

لغوی تشریح

کُسِحَ، یعنی جھاڑو لگا کر جگہ صاف کی گئی۔

شرح و وضاحت

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مختلف مواقع پر سیدنا علی سے متعلق بعض حضرات کا ایسا رویہ یا طرز عمل آیا جسے آپ نے پسند نہیں فرمایا اور آپ نے متعلقہ حضرات کو سیدنا علی کے ساتھ اپنے تعلق اور نسبت کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے ساتھ محبت و مودت کا رویہ اپنانے کی تلقین فرمائی۔ حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر میں غدیر خم کے مقام پر آپ نے اسی طرح کے رویوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اہتمام کے ساتھ لوگوں کو ایک عمومی نصیحت بھی فرمادی، جس کا زیر بحث روایت میں ذکر ہوا ہے۔ انداز کلام اور اسلوب میں جس سطح کا اہتمام اور تاکید موجود تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صحابہ میں آپ کے اس خطبے کا عمومی چرچا ہونے لگا اور سیدنا عمر نے، جو اس موقع پر موجود نہیں تھے، یہ بات معلوم ہونے پر باقاعدہ سیدنا علی کو مبارک باد دی۔

اس خطبے کی اسی اہمیت کے پیش نظر سیدنا علی بھی اپنے دور خلافت میں مخالفین کے اعتراضات کے جواب اور اپنے دفاع میں اس کا حوالہ دیتے تھے۔ عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں:

شَهِدْتُ عَلِيًّا فِي الرَّحَبَةِ يَنْشُدُ النَّاسَ: أَنْشُدُ اللهَ مَنْ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ يَقُولُ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ: ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ'' لَمَّا قَامَ فَشَهِدَ، قَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ: فَقَامَ اثْنَا عَشَرَ بَدْرِيًّا كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَحَدِهِمْ، فَقَالُوا: نَشْهَدُ أَنَّا سَمِعْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ يَقُولُ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ: ''أَلَسْتُ أَوْلَى بِالْمُسْلِمِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَأَزْوَاجِي أُمَّهَاتُهُمْ''؟ فَقُلْنَا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ:

''میں نے سیدنا علی کو (کوفہ کی جامع مسجد کے ساتھ) کھلے میدان میں لوگوں کو یہ قسم دیتے ہوئے سنا کہ جن لوگوں نے غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جس کا میں آقا ہوں، علی بھی اس کا آقا ہے''، وہ کھڑے ہو کر اس کی گواہی دیں۔ عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ اس پر بارہ بدری صحابہ کھڑے ہوئے، جن کو گویا میں اب بھی دیکھ رہا ہوں، اور انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے غدیر خم کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

''فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ، اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ''. (مسند احمد، رقم 943)

فرماتے ہوئے سنا کہ کیا میں مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا، اور کیا میری ازواج ان کی مائیں نہیں ہیں؟ ہم نے کہا کہ یارسول اللہ، بالکل ہیں۔ آپ نے فرمایا: تو پھر جس کا میں آقا ہوں، علی بھی اس کا آقا ہے۔ اے اللہ، جو علی کے ساتھ دوستی رکھے، تو بھی اس کے ساتھ دوستی رکھ اور جو اس کے ساتھ دشمنی رکھے تو بھی اس کے ساتھ دشمنی رکھ۔''

تخریج اور اختلاف طرق

غدیر خم کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گفتگو بہت سے صحابہ سے روایات کی ایک بڑی تعداد میں منقول ہے، تاہم سیدنا عمر کے اس پر خوشی کا اظہار کرنے اور سیدنا علی کو مبارک باد دینے کا ذکر براء بن عازب کی اس روایت میں ہی ملتا ہے۔ انھی کے طریق سے یہ واقعہ درج ذیل مصادر میں بھی نقل ہوا ہے:

مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 32118۔ فضائل الصحابۃ، ابن حنبل، رقم 981، 1006۔ الشریعۃ، آجری، رقم 1480۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں نقل ہوا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس موقع پر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 12121)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر نے بعد میں یہ واقعہ علم میں آنے پر سیدنا علی سے مل کر انھیں مبارک باد دی۔

(3)

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ عُمَرَ خَطَبَ إِلَى عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ابْنَتَهُ أُمَّ كُلْثُومٍ، فَقَالَ عَلِيٌّ: إِنَّمَا حَبَسْتُ بَنَاتِي عَلَى بَنِي جَعْفَرٍ. فَقَالَ:

أَنْكِحْنِيهَا، فَوَاللّٰهِ مَا عَلَى الْأَرْضِ رَجُلٌ أَرْصَدَ مِنْ حُسْنِ عِشْرَتِهَا مَا أَرْصَدْتُ. فَقَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: قَدْ أَنْكَحْتُكَهَا. فَجَاءَ عُمَرُ إِلَى مَجْلِسِ الْمُهَاجِرِينَ بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ، وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ يَجْلِسُونَ ثَمَّ، وَعَلِيٌّ، وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ، وَالزُّبَيْرُ، وَعُثْمَانُ، وَطَلْحَةُ، وَسَعْدٌ، فَإِذَا كَانَ الْعَشِيُّ يَأْتِي عُمَرَ الْأَمْرُ مِنَ الْآفَاقِ وَيَقْضِي فِيهِ، جَاءَهُمْ وَأَخْبَرَهُمْ ذٰلِكَ، وَاسْتَشَارَهُمْ كُلَّهُمْ، فَقَالَ: رَفِّئُونِي. قَالُوا: بِمَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ؟ قَالَ: بِابْنَةِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ. ثُمَّ أَنْشَأَ يُحَدِّثُهُمْ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ قَالَ: كُلُّ نَسَبٍ وَسَبَبٍ مُنْقَطِعٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا نَسَبِي وَسَبَبِي. كُنْتُ قَدْ صَحِبْتُهُ فَأَحْبَبْتُ أَنْ يَكُونَ لِي أَيْضًا.

(سنن سعید بن منصور، کتاب النکاح، رقم 501)

”امام محمد الباقر اپنے والد علی بن الحسین (زین العابدین) سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی کو ان کی بیٹی ام کلثوم کے نکاح کا پیغام دیا۔ سیدنا علی نے کہا کہ میں نے تو اپنی بیٹیوں کو اپنے بھائی جعفر کے بیٹوں کے نکاح میں دینے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ام کلثوم کو میرے نکاح میں دے دیں، بخدا، روے زمین پر کوئی کوئی بھی شخص اس کے ساتھ اتنے اچھے برتاؤ کا اہتمام نہیں کرے گا، جیسا میں کروں گا۔ اس پر سیدنا علی نے کہا کہ میں نے اس کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا۔ پھر سیدنا عمر مہاجرین کی مجلس میں آئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اور منبر کے مابین ہوتی تھی۔ یہاں مہاجرین اور علی، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر، عثمان، طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہم بیٹھا کرتے تھے۔ جب دن کا آخری پہر ہوتا تو سیدنا عمر کے سامنے مملکت کے اطراف سے آنے والے معاملات پیش کیے جاتے تھے اور وہ ان کے متعلق فیصلہ کرتے تھے۔ (اس سلسلے میں) سیدنا عمر بھی مہاجرین کی اس مجلس میں آتے اور ان سب حضرات کے ساتھ مشاورت کرتے تھے۔ (ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے بعد وہ وہاں آئے اور) کہا کہ مجھے (نکاح کی) مبارک باد دو۔ انھوں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، کس کے ساتھ؟ سیدنا عمر نے کہا کہ علی بن ابی طالب کی دختر کے ساتھ۔ پھر وہ انھیں بتانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ہر تعلق اور نسبی رشتہ ختم ہو جائے گا، سوائے اس تعلق اور اس نسبی رشتے کے جو میرے ساتھ ہے۔ (عمر نے کہا کہ)

مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل تھی تو میں نے چاہا کہ مجھے آپ کے ساتھ نسبی تعلق کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔"

لغوی تشریح

رَفِّئُونِی: 'رِفَاء' سے مشتق ہے، جس کا مطلب باہمی موافقت ہوتا ہے۔ عرب میں کسی کو شادی کی مبارک باد دینے کے لیے 'بِالرِّفَاءِ والبَنِین' کے دعائیہ کلمات بولے جاتے تھے، یعنی میاں بیوی کے مابین موافقت رہے اور اولاد نصیب ہو۔ یوں محاورتاً 'رَفِّئُونِی' کا مطلب ہو گا: مجھے شادی کی مبارک باد دو۔

شرح ووضاحت

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبی وخاندانی تعلق کے، قیامت کے روز کارآمد ہونے یا نہ ہونے کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت احادیث میں کی گئی ہے۔ مثلاً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے واضح فرمایا کہ ایمان لائے بغیر محض آپ کے ساتھ رشتہ داری قیامت کے روز ان کے کسی کام نہیں آئے گی:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، اشْتَرُوا أَنْفُسَكُمْ، لاَ أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا. يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ، لاَ أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا. يَا عَبَّاسُ بْنَ عَبْدِ المُطَّلِبِ، لاَ أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللهِ شَيْئًا. وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُولِ اللهِ، لاَ أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللهِ شَيْئًا. وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ، سَلِينِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي، لاَ أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللهِ شَيْئًا.

(بخاری، رقم 2628)

"اے گروہ قریش، اللہ کے ساتھ اپنی جانوں کا سودا خود کرو، میں تمھیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ اے بنی عبد مناف، میں اللہ کی گرفت میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اے عباس بن عبد المطلب، میں اللہ کی بارگاہ میں آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ، میں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد، مجھ سے میرا مال جتنا چاہو، مانگ لو،

لیکن میں اللہ کے معاملے میں تمھارے
کسی کام نہیں آسکتا۔“

ایک دوسری حدیث میں آپ نے واضح فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اپنے اقربا اور متعلقین کے حق میں سفارش کرنے کا اذن حاصل ہو گا، بشرطیکہ وہ آپ کے بعد آپ کے طریقے پر کاربند رہیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ يَقُولُ عَلَى هَذَا الْمِنْبَرِ: مَا بَالُ رِجَالٍ يَقُولُونَ: إِنَّ رَحِمَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ لَا تَنْفَعُ قَوْمَهُ، بَلَى وَاللّٰهِ إِنَّ رَحِمِي مَوْصُولَةٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنِّي أَيُّهَا النَّاسُ فَرَطٌ لَكُمْ عَلَى الْحَوْضِ، فَإِذَا جِئْتُمْ قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، وَقَالَ آخَرُ: أَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، قَالَ لَهُمْ: أَمَّا النَّسَبُ فَقَدْ عَرَفْتُهُ، وَلَكِنَّكُمْ أَحْدَثْتُمْ بَعْدِي وَارْتَدَدْتُمُ الْقَهْقَرَى.

(مسند احمد، رقم 10923)

”میں نے اس منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان لوگوں کا کیا مسئلہ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے ساتھ قرابت داری ان کی قوم کو فائدہ نہیں دے گی؟ کیوں نہیں دے گی؟ بخدا، میں اپنی قرابت داری کا حق دنیا اور آخرت، دونوں جگہ ادا کروں گا۔ (لیکن یہ یاد رکھو) اے لوگو کہ میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہنچوں گا۔ پھر جب تم وہاں آؤ گے تو ایک شخص کہے گا کہ یا رسول اللہ، میں فلاں کا بیٹا فلاں ہوں، اور دوسرا کہے گا کہ میں فلاں کا بیٹا فلاں ہوں۔ لیکن اللہ کا رسول کہے گا کہ تمھارا نسب تو میں نے پہچان لیا، لیکن تم میرے بعد میرے طریقے سے ہٹ گئے تھے اور الٹے پاؤں لوٹ گئے تھے۔“

ایک اور حدیث میں آپ کے اپنے ان اقربا کے حق میں شفاعت کرنے کا بھی ذکر ہوا ہے، جو ایمان تو نہیں لائے، لیکن دنیا میں آپ کی نصرت وحمایت کرتے رہے۔ چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَذُكِرَ عِنْدَهُ عَمُّهُ أَبُو طَالِبٍ، فَقَالَ: ''لَعَلَّهُ تَنْفَعُهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ القِيَامَةِ، فَيُجْعَلُ فِي ضَحْضَاحٍ مِنَ النَّارِ يَبْلُغُ كَعْبَيْهِ، يَغْلِي مِنْهُ أُمُّ دِمَاغِهِ''. (بخاری، رقم 3706)

آپ کے چچا ابو طالب کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: امید ہے کہ قیامت کے دن میری سفارش ان کو فائدہ دے گی اور (ان کے عذاب میں تخفیف کے لیے) انھیں ایسی جگہ رکھا جائے گا جہاں آگ بس ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی، جس سے ان کا دماغ ابلنے لگے گا۔''

اس پہلو سے بھی اور اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبی تعلق کا شرف حاصل کرنے کی غرض سے بھی سیدنا عمر نے آپ کی نواسی کے ساتھ رشتۂ نکاح کی خواہش ظاہر کی جسے سیدنا علی نے ان کی شخصیت اور ان کے جذبے کا احترام کرتے ہوئے قبول کر لیا۔

2۔ سیدہ ام کلثوم کے ساتھ سیدنا عمر کا یہ عقد ان کی صغر سنی میں ہوا تھا۔ بعد میں رخصتی ہوئی اور ان کے بطن سے سیدنا عمر کا ایک بیٹا، زید اور ایک بیٹی، رقیہ پیدا ہوئی۔ سیدنا عمر کی وفات کے بعد سیدنا علی کے بھتیجے عون بن جعفر نے ان سے عقد کیا۔ پھر ان کی وفات کے بعد وہ محمد بن جعفر اور پھر ان کی وفات کے بعد عبد اللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ سیدنا معاویہ کے عہد خلافت میں ان کے بیٹے زید بن عمر ایک تصادم میں چوٹ لگنے سے وفات پا گئے اور عین اسی وقت میں ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان دونوں کی نماز جنازہ عمومی روایات کے مطابق عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے پڑھائی۔ ابن عساکر کی روایت ہے:

وقال الحسين بن علي لعبد الله بن عمر: تقدم فصل على أمك وأخيك فتقدم فصلى عليهم. (تاریخ دمشق 19/489)

''حسین بن علی نے عبد اللہ بن عمر سے کہا: آگے بڑھیے اور اپنی والدہ اور اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھائیے۔ چنانچہ ابن عمر آگے بڑھے اور ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔''

تخریج اور اختلاف طرق

امام زین العابدین کے طریق سے سیدہ ام کلثوم کے نکاح کا یہ واقعہ تفصیلات کے کچھ فرق کے

ساتھ درج ذیل مصادر میں بھی منقول ہے:

المستدرک علی الصحیحین، رقم 4667۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم 12531۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 5710۔ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، رقم 9255۔ فضائل الصحابۃ، ابن حنبل، رقم 1033۔ المطالب العالیۃ، ابن حجر، رقم 4076۔

علی بن الحسین کے علاوہ درج ذیل حضرات نے بھی اس واقعے کی مختلف تفصیلات اپنی روایات میں بیان کی ہیں:

سیدنا حسن بن علی (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم 1276۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 6728)

اسلم مولیٰ عمر (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم 2568۔ حلیۃ الاولیاء، ابی نعیم، رقم 1423)

عکرمہ مولیٰ ابن عباس (مصنف عبد الرزاق، رقم 10049)

مستظل بن حصین (فضائل الصحابۃ، ابن حنبل، رقم 1034۔ معرفۃ الصحابۃ، ابی نعیم، رقم 199)

عطاء خراسانی (الشریعۃ، آجری، رقم 1665، 1770)

(4)

عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ ، قَالَ: ... فَقَالُوا: أَوْصِ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اسْتَخْلِفْ، قَالَ: مَا أَجِدُ أَحَدًا أَحَقَّ بِهَذَا الأَمْرِ مِنْ هَؤُلاَءِ النَّفَرِ — أَوِ الرَّهْطِ — الَّذِينَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ وَهُوَ عَنْهُمْ رَاضٍ، فَسَمَّى عَلِيًّا وَعُثْمَانَ وَالزُّبَيْرَ وَطَلْحَةَ وَسَعْدًا وَعَبْدَ الرَّحْمَنِ، وَقَالَ : يَشْهَدُكُمْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ، وَلَيْسَ لَهُ مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ. (بخاری، رقم 3530)

”عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ ... (سیدنا عمر پر قاتلانہ حملے کے بعد) لوگوں نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین، کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیجیے۔ سیدنا عمر نے کہا کہ میں اس منصب کا حق دار اس جماعت سے زیادہ کسی کو نہیں پاتا جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت راضی تھے۔ سیدنا عمر نے علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد اور عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہم کا نام لیا اور کہا کہ فیصلہ کرنے میں عبد اللہ بن عمر بھی تمھارے ساتھ شریک ہو گا، لیکن خلافت میں اس کا کوئی حق نہیں۔“

شرح ووضاحت

سیدنا ابو بکر اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی وفات اور سیدنا عمر پر قاتلانہ حملے کے بعد مہاجرین کی جماعت میں یہی حضرات تھے جن کا تعلق قریش سے تھا اور جنھیں مہاجرین کے اکابر میں شمار کیا جاتا تھا۔ مسجد نبوی میں مہاجرین کی جو مستقل مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، اس میں بھی یہی حضرات شریک ہوتے تھے (سنن سعید بن منصور، کتاب النکاح رقم، 501)۔ گویا ان حضرات میں خلافت کو محصور قرار دینا سیدنا عمر کا کوئی صواب دیدی اجتہاد نہیں تھا، بلکہ مقررہ اصول کے مطابق انھی میں سے کسی کا بہ طور خلیفہ انتخاب کیا جانا تھا۔ البتہ سیدنا عمر نے اپنے پیش رو کی طرح کسی کو شخصی طور پر نام زد کرنے کے بجاے اس فیصلے کو ان سب حضرات کی باہمی مشاورت اور اتفاق راے پر منحصر کر دیا اور مشاورت کی حد تک اپنے بیٹے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اس مجلس میں شامل کر دیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر کو یہ اندازہ تھا کہ ان میں سے انتخاب سیدنا عثمان یا سیدنا علی میں سے کسی ایک کا ہو گا، چنانچہ انھوں نے نام زدگی کے بعد خاص طور پر ان دو حضرات کو ہی خلافت کی ذمہ داریوں سے متعلق نصیحت فرمائی (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، رقم 3783)۔ اس سے ان دونوں حضرات کی اہلیت اور دیانت پر ان کا اعتماد واضح ہے۔

تخریج اور اختلاف طرق

سیدنا عمر کا یہ ارشاد عمرو بن میمون کے علاوہ معدان بن ابی طلحہ، ابو رافع، سعید بن المسیب، اسلم مولیٰ عمر، عمر مولیٰ غفرۃ، اور مسور بن مخرمہ کے طرق سے بھی الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ درج ذیل مصادر میں نقل ہوا ہے:

صحیح مسلم، رقم 911۔ مسند احمد، رقم 90، رقم 129۔ صحیح ابن حبان، رقم 2126۔ المستدرک علی الصحیحین، رقم 4486۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 1338، رقم 8235۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 32221۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم 15445۔ مسند الحمیدی، رقم 31۔ مسند الطیالسی، رقم 52۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم 171، 190۔ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، رقم 2701، رقم 3779۔

معدان بن ابی طلحہ کے طریق میں اثر کے الفاظ یوں ہیں:

وَإِنَّ أَقْوَامًا يَأْمُرُونَنِي أَنَّ أَسْتَخْلِفَ، وَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُنْ لِيُضَيِّعَ دِينَهُ وَلَا خِلَافَتَهُ، وَلَا الَّذِي بَعَثَ بِهِ نَبِيَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنْ عَجِلَ بِي أَمْرٌ فَالْخِلَافَةُ شُورَى بَيْنَ هَؤُلَاءِ السِّتَّةِ، الَّذِينَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَنْهُمْ رَاضٍ. (مسلم، رقم 911)

”کچھ لوگ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ میں کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دوں۔ اللہ تعالیٰ نہ اپنے دین کو ضائع کرے گا اور نہ اپنی خلافت کو اور نہ اس چیز کو جسے دے کر اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اگر مجھے مہلت نہ ملی تو خلافت کی ذمہ داری شوریٰ کے اصول پر ان چھ افراد میں سے کسی کو دی جائے گی، جن سے اپنی وفات کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے۔“

(5)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ عُمَرُ لِأَصْحَابِ الشُّورَى: لِلّٰهِ دَرُّهُمْ لَوْ وَلَّوْهَا الْأُصَيْلِعَ، كَيْفَ يَحْمِلُهُمْ عَلَى الْحَقِّ، وَإِنْ حُمِلَ عَلَى عُنُقِهِ بِالسَّيْفِ، قَالَ: فَقُلْتُ: تَعْلَمُ ذَلِكَ مِنْهُ وَلَا تُوَلِّيهِ؟ قَالَ: إِنْ أَسْتَخْلِفْ فَقَدِ اسْتَخْلَفَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي، وَإِنْ أَتْرُكْ فَقَدْ تَرَكَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي. (المستدرک علی الصحیحین، رقم 4501)

”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر نے اصحاب شوریٰ کے متعلق کہا کہ یہ لوگ کیا ہی اچھا فیصلہ کریں اگر یہ ذمہ داری اس کو دے دیں جس کے سر پر بال نہیں (اور دیکھیں کہ) وہ کیسے لوگوں کو حق پر قائم رکھتا ہے، چاہے اس کی گردن پر کوئی تلوار لے کر سوار ہو۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ آپ ان کی یہ خوبی جانتے ہوئے بھی انھیں خلیفہ مقرر نہیں کر رہے؟ سیدنا عمر نے کہا کہ اگر میں کسی کو جانشین مقرر کروں تو مجھ سے بہتر شخص (ابو بکر رضی اللہ عنہ) نے بھی جانشین مقرر کیا، اور اگر میں نہ کروں تو بھی مجھ سے بہتر ہستی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی کو جانشین مقرر نہیں فرمایا۔“

لغوی تشریح

الْأُصَيْلِعَ، اصلع کی تصغیر ہے، یعنی جس کے سر پر بال نہ ہوں، گنجا۔

شرح ووضاحت

سیدنا عمر کو اندازہ تھا کہ اصحاب شوریٰ، سیدنا عثمان اور سیدنا علی میں سے ہی کسی ایک کا انتخاب کریں گے، جب کہ زیر بحث اثر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا ذاتی رجحان سیدنا علی کے انتخاب کی طرف تھا، کیونکہ ان کی رائے میں وہ لوگوں کو جادۂ صواب پر قائم رکھنے میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکتے تھے۔ سیدنا علی کے لیے، جن کے سر کے بال کافی گر چکے تھے، تصغیر کے صیغے (أُصَيْلِعَ) کے استعمال سے دونوں کے مابین بے تکلفی اور محبت ومودت بھی ظاہر ہو رہی ہے، جس سے دونوں حضرات کے ذاتی تعلق کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

تخریج اور اختلاف طرق

ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ابن عساکر نے بھی "تاریخ دمشق" (45/428) میں نقل کیا ہے، جب کہ ان کے علاوہ عبد الرحمٰن بن عبد القاری اور عمرو بن میمون کی روایات میں بھی سیدنا علی سے متعلق سیدنا عمر کا یہ تبصرہ نقل ہوا ہے۔

عبد الرحمٰن بن عبد القاری کہتے ہیں:

قَالَ عُمَرُ لِلْأَنْصَارِيِّ: مَنْ تَرَى النَّاسَ يَقُولُونَ يَكُونُ الْخَلِيفَةَ بَعْدِي؟ قَالَ: فَعَدَّدَ رِجَالًا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَلَمْ يُسَمِّ عَلِيًّا، فَقَالَ عُمَرُ: فَمَالَهُمْ مِنْ أَبِي الْحَسَنِ؟ فَوَاللَّهِ إِنَّهُ لَأَحْرَاهُمْ إِنْ كَانَ عَلَيْهِمْ أَنْ يُقِيمَهُمْ عَلَى طَرِيقَةٍ مِنَ الْحَقِّ.
(مصنف عبد الرزاق، رقم 9471)

"سیدنا عمر نے (وہاں موجود) انصاری سے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ کون ہوگا؟ اس نے مہاجرین میں سے کئی لوگوں کا نام لیا، لیکن سیدنا علی کا ذکر نہیں کیا۔ عمر نے پوچھا کہ لوگوں کو ابو الحسن سے کیا مسئلہ ہے؟ بخدا، اگر وہ ان پر خلیفہ مقرر ہو تو وہ سب سے بڑھ کر اس کا اہل ہے کہ انھیں

حق کے راستے پر قائم رکھے۔"

یہ اثر "الادب المفرد" للبخاری (رقم 600) میں بھی مروی ہے۔

عمرو بن میمون کا بیان ہے:

فَلَمَّا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِ عُمَرَ قَالَ عُمَرُ: لَوْ وَلَّوْهَا الْأَجْلَحَ سَلَكَ بِهِمُ الطَّرِيقَ، فَقَالَ لَهُ ابْنُ عُمَرَ: فَمَا يَمْنَعُكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ؟ قَالَ: أَكْرَهُ أَنْ أَتَحَمَّلَهَا حَيًّا وَمَيِّتًا.
(الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، رقم 3783)

"جب یہ لوگ سیدنا عمر کے پاس سے نکل گئے تو انھوں نے کہا کہ اگر یہ اس بے بالوں کے سر والے کو یہ ذمہ داری دے دیں تو وہ انھیں سیدھے راستے پر قائم رکھے گا۔ اس پر ابن عمر نے کہا کہ اے امیر المومنین، آپ کے لیے (علی کو خلیفہ مقرر کرنے میں) کیا مانع ہے؟ عمر نے کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں زندگی میں بھی اس ذمہ داری کو اٹھائے رکھوں اور مرنے کے بعد بھی۔"

عمرو بن میمون کا یہ اثر درج ذیل مصادر میں بھی مروی ہے:

المصنف، عبد الرزاق، رقم 9471۔ انساب الاشراف، بلاذری 2/103۔ الابانۃ الکبریٰ، ابن بطۃ 8/253۔ حلیۃ الاولیاء، ابی نعیم، رقم 5185۔

(6)

عَنْ عُرْوَةَ وَهُوَ ابْنُ الزُّبَيْرِ، أَنَّ رَجُلًا وَقَعَ فِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ بِمَحْضَرٍ مِنْ عُمَرَ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: تَعْرِفُ صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ؟ هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَعَلِيٌّ ابْنُ أَبِي طَالِبِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَلَا تَذْكُرْ عَلِيًّا إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّكَ إِنْ أَبْغَضْتَهُ آذَيْتَ هَذَا فِي قَبْرِهِ. (فضائل الصحابۃ، احمد بن حنبل، رقم 1054)

"عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا عمر کی موجودگی میں سیدنا علی بن ابی طالب کی شان میں گستاخی کی تو حضرت عمر نے اس سے کہا: تم اس ہستی کو جانتے ہو جو اس قبر میں آرام فرما ہے؟ یہ محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہیں اور علی بھی ابو طالب کے بیٹے ہیں جو

عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس لیے علی کا ذکر ہمیشہ خیر کے ساتھ کیا کرو، کیونکہ اگر علی کو ناراض کروگے تو اس قبر میں موجود ہستی کو اذیت پہنچاؤ گے۔"

تخریج اور اختلاف طرق

ابن زبیر کا یہ اثر ابن عساکر نے "تاریخ دمشق" (42/519) اور الرافعی نے "التدوین فی اخبار قزوین" (1/293) میں بھی نقل کیا ہے۔

[باقی]

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

محمد ذکوان ندوی

کلامِ رسول کا مطالعہ

[”نقطۂ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

’حافظِ قرآن‘ کی اصطلاح کے مانند ’حافظِ حدیث‘ بھی علما کے درمیان ایک معروف اصطلاح ہے۔ حافظ جمال الدین المِزی نے حافظِ حدیث کی تعریف بیان کرتے ہوئے درست طور پر لکھا ہے:

الحافظ: ما فاته أقلّ ما یعرفه. (المختصر الوجیز فی علوم الحدیث 235)

”حافظِ حدیث وہ شخص ہے جس کا علم حدیث اُس کے جہل حدیث سے بڑھا ہوا ہو۔“

یعنی وہ حدیث کا ایک متبحر عالم ہو اور حدیث پر گہری نظر رکھتا ہو۔

حافظِ حدیث کی اصطلاح پر غور کرتے ہوئے خیال آیا کہ اِس کی مذکورہ فنی تعریف سے ہٹ کر، ایک سچے عالم دین کے لیے جس طرح لفظاً یا معناً حافظِ قرآن ہونا ضروری ہے، اُسی طرح اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حدیثِ رسول کا گہرا اور تفصیلی مطالعہ کرکے اُس کے اندر حافظِ حدیث کا درجہ حاصل کرے، وہ اِس بات کی کوشش کرے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ ارشاداتِ رسول

مستحضر رہیں، وہ قرآن کے ساتھ احادیث کا متبحر عالم بنے۔ یہ علم کا حسن بھی ہو گا اور فہم دین کا ایک بہترین طریقہ بھی۔ حدیث میں درک کے بغیر کوئی شخص پیغمبرانہ حکمت اور بصیرت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شرح صحیح البخاری، ابن بطال (449 ہجری)، عمدۃ القاری، بدرالدین عینی (855 ہجری)، وغیرہ۔ تاہم علما کے درمیان صحیح بخاری کی شروحات میں سب سے اہم شرح وہ مانی جاتی ہے جو حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھی ہے۔ اُس کا نام یہ ہے: فتح الباری بشرح صحیح البخاری۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریباً 25 سال کے عرصے میں اِس کتاب کو لکھ کر تیار کیا۔ 817 ہجری سے 842 ہجری کے درمیان یہ کتاب مرتب ہوئی۔ اُس وقت مصنف کی عمر 45 سے 55 کے درمیان تھی۔ ابن حجر کے متعدد تلامذہ اِس کتاب کی تیاری میں اُن کے ساتھ مسلسل تعاون کر رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ امام شوکانی (وفات: 1250 ہجری) سے ایک بار درخواست کی گئی کہ وہ بخاری کی شرح لکھیں۔ امام شوکانی نے بہ طورِ تلمیح ایک خوب صورت جملے میں اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا: 'لاھجرۃ بعد الفتح' (فتح کے بعد اب کوئی ہجرت نہیں)، یعنی "فتح الباری" کے بعد اب اِس طرح کی دوسری شرح لکھنا محال ہے۔ یہ گویا فتح کے بعد دوبارہ ہجرت کے ہم معنی ہو گا۔

"فتح الباری" کی بابت علامہ انور شاہ کشمیری (وفات: 1933ء) نے بجا طور پر کہا تھا کہ وہ حدیث کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ دین کا ہر وہ طالب علم جو احادیث و علوم احادیث کے تفصیلی مطالعے کا ذوق رکھتا ہو، اُس کو چاہیے کہ وہ "فتح الباری" کو ضرور اپنے مطالعے میں رکھے۔ اِس کتاب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اِس میں ایک ہی مقام پر کسی بحث کے متعدد پہلو یکجا پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ لغوی مباحث، احادیث و آثار کے متعدد طرق، فقہا اور اصحاب و تابعین، نیز دیگر اہل علم کی آرا وغیرہ۔

خدا کا شکر ہے کہ اب انیس السّاری (نبیل بن منصور الکویتی) کے نام سے "فتح الباری" کی تخریج بھی مؤسّسۃ السّماحۃ، بیروت-لبنان-2005ء سے شائع ہو چکی ہے۔

احادیث کے مطالعے میں "مشکوٰۃ المصابیح" بے حد اہم کتاب ہے۔ اِس میں احادیث کے

تقریباً تمام مباحث پر منتخب روایات جمع کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص صرف اِس ایک کتاب سے کما حقہٗ استفادہ کر سکے تو ان شاء اللہ اِسی کا مطالعہ اُس کے لیے کافی ثابت ہو گا۔ ''مشکوٰۃ'' کی شروحات میں سب سے زیادہ اہم شرح ''مرقاۃ المفاتیح'' (ملا علی قاری الہروی) نظر آئی۔ یہ شرحی مجموعۂ حدیث، بلاشبہ ایک اہم علمی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

''مشکوٰۃ المصابیح'' کے مقدمۃ التحقیق میں اُس کے فاضل محققین نے ''مشکوٰۃ'' کے متعلق بجا طور پر لکھا ہے: 'فھوکتاب حافل، شامل للاحادیث والآثار المتعلقة بالعلم والعمل، وبکل ناحیة من نواحی الحیاة' (مشکوٰۃ المصابیح، دار الارقم، بیروت، 5)

''مشکوٰۃ'' اصلاً ''مصابیح السنہ'' (امام بغوی) کی کتاب کا مہذب اور اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ البغوی کی وفات کے دو سو سال بعد الطیبی (743 ہجری) اور الخطیب التبریزی (740 ہجری) جیسے دو بڑے علما نے ''مصابیح السنہ'' پر کام کیا۔ اُس کے بعد یہ کتاب ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے نام سے وجود میں آئی۔

کلامِ رسول کی عظمت

ضماد بن ثعلبہ ازدی رضی اللہ عنہ (وفات: 91 ہجری) کا واقعہ ہے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے چند الفاظ سنے تو شدتِ تاثر کے تحت انھوں نے کہا: 'لقد سمعتُ قولَ الکھنة، وقولَ السَحَرة، وقولَ الشعراء، فما سمعتُ مثلَ کلماتك ھؤلاء، ولقد بَلغْنَ ناعوسَ البَحر.' (مسلم، رقم 2008)، یعنی میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں، سب کا کلام سنا ہے، مگر آپ کے اِس کلام جیسا کبھی میں نے کوئی کلام نہیں سنا۔ یہ کلمات تو سمندر کی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔

خدا کا پیغمبر ہر اعتبار سے، خدا کی ایک روشن دلیل ہوا کرتا ہے، خواہ اُس کا کلام ہو یا اُس کی شخصیت۔ یہی وجہ ہے کہ عبد اللہ بن سلام (وفات: 43 ہجری) جیسے غیر معمولی ذہین اور متبحر شخص نے آپ کا چہرہ دیکھا تو اُن کی زبان سے نکلا: 'أن وَجْھَه لیْسَ بوجهِ کذّاب' (صحیح ابن خزیمہ، رقم 2648)، یعنی یہ ہرگز کسی کذاب آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ ایمان کا تقاضا اور وقت کا مطالبہ ہے کہ اب کلامِ الٰہی کی تلاوت و تدبر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کلامِ رسول کا مطالعہ اور اُس پر غور و فکر کیا جائے۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

کوفہ کا سیاسی کردار: ایک جائزہ

(1)

اسلام کی پہلی صدی کے نصف اوّل کے اختتام تک مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کے خلاف کوفہ جس سیاسی تحریک کا مرکز بن کر سامنے آیا، اُس کی بنیاد اُسی وقت پیدا ہو گئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں قریش کی سیادت سارے جزیرہ نماے عرب پر قائم ہو رہی تھی۔ عرب کے بدوی قبائل کو قریش کی سیادت گوارا تھی اور نہ ان کی آزاد منشی کسی نظم اجتماعی کو طوقِ گلو بنانے پر آمادہ تھی۔ اُن کے کچھ قبائل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کی بنا پر قریش سے ہم سری کے مدعی اور ان کے حریف بھی تھے۔[1] مکہ، مدینہ، یمن، طائف وغیرہ کے متمدن عربوں کے برعکس، یہ قبائل زراعت، تجارت اور تمدن کے بغیر قدرتی وسائل پر انحصار کرتے اور وسائل کی کم یابی کے سبب حرص و ہوس میں مبتلا رہتے تھے۔ چنانچہ چھینا جھپٹی، لڑائی جھگڑے اور

---

[1]۔ عرب میں موجود قبائلی تقسیم کے لحاظ سے عدنانی قبائل میں سے ربیعہ اور مضر قبائل ایک دوسرے کے حریف اور رقیب تھے۔ مضر کی قیادت قریش کے پاس تھی۔ ان کے مقابل ربیعہ قبائل تھے جو زیادہ تر بدوی تھے۔ ان میں نمایاں ترین بنو تمیم تھے، جو قریش سے ہم سری کے مدعی تھے۔ انھی میں سے کچھ قبیلوں میں بیٹیوں کو زندہ دفنانے کا رواج بھی تھا (فجر الاسلام، احد امین، موسسۃ ھنداوی، 2017 المملکۃ المتحدہ، 20)۔

ڈاکا زنی کے نہ صرف عادی تھے، بلکہ اس پر فخر بھی کرتے اور تمدن اور آسایشوں کا مذاق اڑاتے تھے۔[2] اپنے مفادات کی خاطر اپنے پرائے کا لحاظ نہ کرتے تھے۔[3] اس لیے اپنے قبیلے کے لوگوں سے

---

[2]۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ قریش کو اپنی یہ نعمت یاد کراتا ہے کہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے عرب کے بدو رہزن بھی ان کے قافلے نہیں لوٹتے تھے۔ وہ امن میں رہتے تھے، جب کہ ان کے ارد گرد لوگ غارت گری اور اغوا کا شکار رہتے تھے۔

درج ذیل ارشادات میں یہ ذکر ہوا ہے:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ. اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ. فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ. الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ. (قریش 106:1-4)

”قریش مانوس کیے گئے، وہ سردی اور گرمی کے سفروں سے مانوس کیے گئے۔ سو (اور کچھ نہیں تو تنہا) اِسی کے باعث اُنھیں چاہیے کہ اِس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے (اِن بنجر پہاڑوں کی) بھوک میں اُنھیں کھلایا اور (اِن کے) خوف میں اُنھیں امن عطا فرمایا۔“

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ. (العنکبوت 67:29)

”کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ایک مامون حرم بنایا (جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں)، دراں حالیکہ اِن کے گرد و پیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی باطل ہی کو مانتے ہیں اور اللہ کی اِس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟“

[3]۔ شاعر قطامی تغلبی کا قصیدہ ہے:

وَمَن تكُنِ الحضارةُ أَعجَبَتهُ	فأيَّ أناسِ باديةٍ تَرَانا
وَمَن رَبَطَ الجِحاشَ فإنَّ فينا	قناَسُلباً وأفراساً حِسانا
وكُنَّ اذا أَغَرنَ على جَنابٍ	وأَعوَزهُنَّ كوزٌ حيث كانا
أغرنَ من الضَّبابِ على حَلالٍ	وضبةَ إنَّهُ مَن حانَ حانا
وأحياناً على بَكرٍ أخينا	إذا ما لم نَجِد إلا أخانا

(فجر الاسلام، احمد امین 18)

بھی بھڑ جاتے تھے۔ اس طرز زندگی نے اُنھیں خود غرض، اجڈ، جفاکش، آزاد منش اور انارکیت پسند بنا دیا تھا۔[4] اِن حالات نے اُنھیں گہرے غور و فکر کے لائق نہ چھوڑا تھا۔ چنانچہ وہ سطحیت پسند تھے۔ جب وہ علم کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کی یہی سطحیت پسندی حرفیت پسندی کی صورت اختیار کر گئی۔ اُن کی قرآن فہمی کے عجیب نمونے سامنے آئے۔[5] اُنھوں نے ہر اس سنت کا بھی انکار کیا جو

”جسے تمدنی زندگی پسند آئی ہو، اسے چھوڑو۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ تو ہمیں کس قسم کا بدوی سمجھتا ہے۔ جو اپنے دروازے پر گدھے کے بچے باندھتا ہو، ان سے گفتگو نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تو سخت لچک دار نیزے اور حسین حسین گھوڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ گھوڑے لوگوں کی کسی جماعت پر لوٹ مار کر رہے ہوں اور جہاں وہ لوٹ مار کرنا چاہتے ہوں وہاں لوٹ مار کرنا مشکل ہو جائے تو وہ ضباب کے پڑوسیوں پر اور خود ضبۃ پر لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں، کیونکہ بات تو یہ ہے کہ جس کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ قریب آ ہی گیا، اب اسے کون ٹال سکتا ہے۔ اور کبھی کبھی خود اپنے بھائی بکر پر بھی لوٹ مار کر لیتے ہیں، جب کہ اپنے بھائی کے سوا ہمیں کوئی دوسرا قبیلہ نہ ملتا ہو۔ (ترجمہ، عمر احمد عثمانی، فجر الاسلام، دوست ایسوسی ایٹس، اردو بازار، لاہور، ص 29-30)

[4]۔ حضرت ابو بکر کے عہد میں انھی بدوی قبائل میں سے کچھ نے حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ زکوٰۃ کو ٹیکس یا خراج کی نوعیت کی چیز سمجھتے تھے۔ اس بارے میں روایت ہے کہ قرۃ بن ہبیرہ نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا تھا: ”اے عمرو، عرب لوگ خوشی سے یہ ٹیکس نہیں دے سکتے۔ اگر تم انھیں اس سے معاف کر دو اور ان کے مال ان سے نہ لو تو وہ تمھاری اطاعت اور فرماں برداری کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے یہ نہ مانا تو عرب لوگ تمھارے جھنڈے کے نیچے کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔“ (فجر الاسلام، ترجمہ عمر احمد عثمانی، ص 121)

[5]۔ قبیلہ طے ایسا ہی ایک قبیلہ تھا جو ڈاکا زنی کا عادی تھا۔ اس کے سردار عدی بن حاتم کے بارے میں تفسیری روایت میں ایک قصہ نقل ہوا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید میں روزوں کے اوقات کے بیان کرنے والے الفاظ ’خیط الابیض‘ اور ’خیط الاسود‘ کو ان کے مجازی معنی میں لینے کی بجاے لغوی مفہوم میں لیا اور ایک کالا اور ایک سفید دھاگا لے کر تکیے پر رکھ دیا کہ جب روشنی انھیں ممتاز کر دے گی تو سحر کا وقت ختم ہو گا۔ (بخاری، رقم 4509)

اُن کے فہم قرآن کے خلاف پڑتی تھی۔[6]

قرآن مجید ان لوگوں کا ذکر ''اعراب'' (بدو یا دیہاتی) کے نام سے کرتا ہے۔ سورۂ حجرات میں انھیں خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سورت اُن کی خصلتوں کا ایک جامع نقشہ پیش کرتی ہے اور حیرت انگیز طور پر ان کے ہاتھوں پیش آمدہ فتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مسلمانوں سے مطلوب رویوں اور ان کے برپا کردہ فتنے کے خاتمے کے لیے اقدامات بھی تجویز کرتی ہے۔

سورۂ حجرات کے بیان میں اُن کے زعمِ خود راستی، احساسِ برتری، بدلحاظی، دُشنام بازی، تہمت طرّازی، افواہ سازی، اور دین کی روح اور اُس کے حدود سے ناآشنائی کے خصائص نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی رائے کو رسول اللہ کی رائے پر ترجیح دینے میں کوئی باک محسوس نہ کرتے،[7] اسلام قبول کرنے کو سیاسی وابستگی کے مترادف سمجھتے، احسان جتاتے کہ ایمان لا کر اُنھوں نے

تحکیم کے موقع پر جب حکمین مقرر کیے گئے تو انھوں نے اس بنا پر تحکیم کو کفر قرار دیا کہ قرآن کو چھوڑ کر انسانوں کو حکم بنایا گیا ہے، جب کہ حکم صرف اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔ 'اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ' کو انھوں نے اپنا مقصد بنالیا تھا، مگر خود اس کے اطلاق اور مضمرات کو بیان کرنے سے وہ قاصر تھے۔

[6]۔ خوارج سنت سے شادی شدہ زانی کے رجم، موزوں پر مسح، پھوپھی اور بھتیجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، کیونکہ ان کے مطابق اس سے قرآن کے متعلقہ احکام میں تبدیلی لازم آتی ہے۔

[7]۔ الحجرات 49:1-2۔ 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ.'

(ایمان والو، اللہ اور اُس کے رسول کے آگے اپنی رائے کو مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے۔ ایمان والو، اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز پر اونچا نہ ہونے دو اور نہ اُس کو اُس طرح آواز دے کر پکارو، جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارا کیا کرایا سب اکارت ہو جائے اور تمھیں احساس بھی نہ ہو۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا،[8] اِس لیے اُنھیں خصوصی پروٹوکول ملنا چاہیے، جس کے لیے وہ وقت بے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا مطالبہ لیے ازواج مطہرات کے گھروں کے باہر کھڑے ہو کر آوازیں لگاتے۔[9] اپنے حریف قبائل سے اپنے پرانے حساب چُکتا کرنے کے لیے یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اُن کے خلاف بھڑکانے کی کوشش میں جھوٹا پراپیگنڈا کرتے۔[10] اِس تناظر میں اللہ تعالیٰ نے اُنھیں فاسق قرار دیا اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اُن کے پراپیگنڈا پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہ کریں، مبادا غلط فہمی میں کسی قوم سے جا بھڑیں اور بعد میں پچھتانا پڑے۔[11] (ان کی یہی خصلت بعد میں بڑے فتنے

---

[8] ۔ الحجرات 14:49۔ 'قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ.'

(یہ بدوی (بڑا احسان جتا کر) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں، یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی ہے۔ ایمان تو ابھی تمھارے دلوں کے اندر داخل تک نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔ (سو اپنی اصلاح کر لو) یقیناً، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔)

یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡکَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ ۚ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ہَدٰىکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ. (الحجرات 17:49)

''یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ اِنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کہہ دو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، اگر تم (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو۔''

[9] ۔ الحجرات 4:49۔ 'اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ.'

(اِس میں کچھ شک نہیں، (اے پیغمبر) کہ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، اُن میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔)

[10] ۔ یہ لوگ بنو تمیم سے تھے (تفسیر ابن کثیر 7/365)۔

[11] ۔ الحجرات 6:49-7۔ 'یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَہَالَۃٍ

پیدا کرنے میں ان کی کامیابی کا باعث بنی)۔ اُن کے دعوائے ایمان پر اللہ تعالیٰ نے تبصرہ کیا کہ یہ لوگ صرف تسلیم ہوئے ہیں، ایمان کی حقیقت اُن کے دلوں میں داخل نہیں ہوئی۔[12]

فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ. وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ؕ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ.'

(ایمان والو، اگر (اِن پکارنے والوں میں سے) کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی اہم خبر لائے تو اُس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم جذبات سے مغلوب ہو کر کسی قوم پر جا چڑھو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ اور تم یہ بات بھی اچھی طرح جان رکھو کہ تمھارے اندر خدا کا رسول موجود ہے، (لہٰذا کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ اپنی رایوں پر اصرار کرو)۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لیا کرتا تو تم بڑی مشکل میں پڑ جاتے، (جس طرح اِس سے پہلے پڑے رہتے تھے)، مگر اللہ نے تمھارے آگے ایمان کو محبوب بنایا اور اُس کو تمھارے دلوں میں اچھا کر دکھایا ہے اور کفر اور فسق اور پیغمبر کی نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں سخت ناپسندیدہ ٹھیرایا ہے۔ یہی لوگ راست رو ہیں (کہ اِس نعمت سے بہرہ یاب ہیں۔))

[12]۔ الحجرات 49: 14-18۔ 'قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ. قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ۚ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.'

(یہ بدوی (بڑا احسان جتا کر) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں، یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی ہے۔ ایمان تو ابھی تمھارے دلوں کے اندر داخل تک نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔ (سو اپنی اصلاح کر لو) یقیناً، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ (یاد رکھو)، مومن تو در حقیقت وہی ہیں جو

سورۂ توبہ اور سورۂ فتح میں بھی اُن کا کردار زیر بحث آیا ہے:

یہ مسلمانوں کے سخت بد خواہ تھے۔[13] سیاسی فوائد کے پیشِ نظر اُنھوں نے منافقانہ روش اختیار کر لی تھی۔ اپنے جان و مال کو مسلمانوں کی حفاظت میں یا دین کے دشمنوں کے خلاف جنگ کے خطرے میں ڈالنے سے گریز کرتے اور عذر خواہی کر کے جان چھڑاتے تھے۔[14]

اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی سچے لوگ ہیں۔ اِن سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو؟ دراں حالیکہ جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اللہ اُسے جانتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ اِنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کہہ دو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، اگر تم (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ زمین اور آسمانوں کا سارا غیب اللہ کے علم میں ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔)

[13]۔ التوبہ 9:98۔ 'وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ.'

(اِن بدویوں میں وہ بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمھارے لیے زمانے کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش اِنھی پر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔)

[14]۔ التوبہ 9:90۔ 'وَ جَآءَ الۡمُعَذِّرُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ لِیُؤۡذَنَ لَہُمۡ وَ قَعَدَ الَّذِیۡنَ کَذَبُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ؕ سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ.'

(بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ اُنھیں بھی (پیچھے رہنے کی) اجازت مل جائے اور جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے (ایمان کا) جھوٹا عہد کیا تھا، وہ (اِس کے بغیر ہی گھروں میں) بیٹھے رہے۔ اِن کے منکروں کو عنقریب ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔)

مَا کَانَ لِاَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ وَ مَنۡ حَوۡلَہُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ یَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ وَ لَا یَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِہِمۡ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ لَا یُصِیۡبُہُمۡ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخۡمَصَۃٌ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا یَطَـُٔوۡنَ مَوۡطِئًا یَّغِیۡظُ الۡکُفَّارَ وَ لَا یَنَالُوۡنَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّیۡلًا اِلَّا کُتِبَ لَہُمۡ بِہٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ. (التوبہ 9:120)

”حقیقت یہ ہے کہ مدینہ والوں اور اُن کے گردونواح کے بدویوں کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھے رہیں اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو اُس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اِس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اُن کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور (پیغمبر کے) منکروں کو رنج پہنچانے والا جو قدم بھی وہ اٹھاتے ہیں اور (اُس کے) کسی دشمن کو جو چرکا بھی لگاتے ہیں، اُن سب کے بدلے میں ایک نیکی اُن کے لیے لکھ دی جاتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ خوبی اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۙ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (التوبہ 9:94-97)

”تم لوگ (غزوۂ تبوک کے سفر سے) اُن کی طرف پلٹو گے تو وہ تمھارے سامنے طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے۔ تم صاف کہہ دینا کہ بہانے نہ بناؤ، ہم تمھاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے، اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دیے ہیں۔ اب اللہ اور اُس کا رسول تمھارا عمل دیکھیں گے، پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ تمھاری واپسی پر وہ تمھارے سامنے اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے صرف نظر کرو۔ تو اُن سے صرف نظر ہی کر لو، اِس لیے کہ وہ سراسر گندگی ہیں اور اُس کے بدلے میں جو کماتے رہے، اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ۔ سو اگر تم اُن سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ راضی نہیں ہو گا، اِس لیے کہ ایسے بدعہد لوگوں سے اللہ ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بدوی عرب کفر اور نفاق میں زیادہ سخت اور اِسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے، اُس کے حدود سے بے خبر رہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔“

یہ اعراب مدینے کے اطراف میں بھی رہتے تھے۔[15] قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مخلص مومنین کی بھی ایک تعداد تھی۔[16] اور یہی وہ افراد تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبائل کے انحرافات میں ان کا ساتھ نہیں دیا اور دین اسلام پر مستقیم رہے۔

[باقی]

---

[15] ۔التوبہ 9: 101۔ ’وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ.‘

(تمھارے اردگرد جو بدوی رہتے ہیں، اُن میں بھی بہت سے منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی۔ وہ اپنے نفاق میں طاق ہو چکے ہیں۔ تم اُن کو نہیں جانتے، ہم اُن کو جانتے ہیں۔ اُنھیں عنقریب ہم دو مرتبہ سزا دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔)

[16] ۔التوبہ 9: 99۔ ’وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۚ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ.‘

(اور انھی بدویوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اُس کو اور رسول کی دعاؤں کو خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سو اِس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں اُن کے لیے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ اللہ اُن کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔)

نعیم احمد بلوچ

شادی کے لیے بلوغت کی شرط

مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق قائم کرنے کے لیے نکاح کو قانونی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے آج کی جدید تہذیب ہو یا قدیم ترین سماج، الہامی مذاہب یا انسان کے بنائے ہوئے مذاہب، ہر قانون و شریعت میں مرد و عورت کی بلوغت کو بنیادی شرط مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی خاص تہذیب و تمدن سے ہے، نہ کسی خاص زمانے سے۔ جب سے انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے اس دنیا میں بس رہا ہے، وہ نکاح ہو یا دوسرے فریق کے ساتھ جنسی تعلق کا معاملہ، بلوغت ہی کے ساتھ مشروط ہے۔ اس سے اگر انحرافات ہوئے ہیں تو انسانی ضمیر نے اسے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کی حیثیت ہمیشہ ایک ناقابل قبول عمل ہی کی رہی ہے۔ اسے شدید ناپسند کیا گیا ہے، اسے جرم سمجھا گیا ہے اور جس معاشرے میں بھی اس طرح کی کوئی رسم یا رواج جاری ہوا ہے، اس معاشرے نے اس کی اصلاح کی ہے اور اسے اپنے اندر سے ختم کیا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ انسانی ضمیر کے لیے فطرت اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور ان کے بعد صحابہ کے دور میں اس بات کا کوئی علمی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی تہذیبی اور سماجی روایت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ نکاح اور جنسی تعلق کے لیے بلوغت کا عمومی طور پر کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اور یہ اس سماجی حقیقت کے باوجود ہے کہ عرب کے اس معاشرے میں لونڈیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جن کے رسالت کے ظہور سے پہلے کوئی سماجی، جسمانی یا اخلاقی حقوق نہیں تھے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈیڑھ صدی ہجری کے بعد سے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں، ایک بہت بڑی اکثریت یقینی

طور پر یہ رائے رکھتی ہے کہ نکاح یا جنسی تعلق استوار کرنے میں عمر کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ چنانچہ ''بدایۃ المجتہد'' میں علامہ ابن رشد نکاح کے شرائط میں تمام ائمۂ فقہا کی رائے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوہر دیدہ، مگر نابالغ عورت کے بارے میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی رائے ہے کہ باپ اسے نکاح پر مجبور کر سکتا ہے، جب کہ امام شافعی کے نزدیک باپ اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ متاخرین فقہا کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں تین اقوال ہیں: ایک یہ کہ وہ شادی کے وقت نابالغ تھی اور پھر طلاق ہو گئی۔ اگر وہ اب بھی نابالغ ہے تو باپ جبراً اس کا نکاح کرا سکتا ہے۔ دوسرا قول ہے کہ اگر وہ بالغ ہو گئی ہے تو طلاق کے بعد اسے نکاح پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ بالغ مطلقہ کو نکاح پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔''(635)

بہ ظاہر یہ بات بعید از قیاس نظر آتی ہے کہ علماے اسلام اس قدر فطری معاملے میں ایسی رائے کیوں رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ شادی کا معاملہ تو اسی وقت درپیش ہوتا ہے جب فریقین بالغ ہوں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ جمہور علماے اسلام کے نزدیک قرآن و حدیث کے بعض قرائن اس پر واضح ہیں کہ شریعت کو نابالغ عورت و مرد، یعنی بچوں کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، حتیٰ کہ نابالغ بچیوں کے ساتھ نکاح کر کے ان سے جنسی تعلق بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ آیئے، ہم مسلمانوں کی علمی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی علماے اسلام اس حوالے سے یہی رائے رکھتے ہیں اور کیا واقعی قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے؟

1۔ شادی کے لیے مرد و عورت کی عمر کی کوئی تحدید نہیں۔

2۔ کیا نابالغ بچیوں سے نکاح کر کے ان سے جنسی تعلق بنایا جا سکتا ہے؟

3۔ کیا اسلام میں نابالغ مرد و عورت کے نکاح اور ان کے درمیان جنسی تعلق رکھنے کی عام اجازت دی گئی ہے یا اسے محض قبول کیا گیا ہے اور اسے ایک خاص دور تک محدود رکھا گیا ہے؟

نابالغ بچی سے نکاح کے پیش کردہ دلائل

اس حوالے سے پہلے فقہا کی رائے جانتے ہیں۔

علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں:

”علماے کرام کا اس پر اجماع ہے کہ والد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی چھوٹی بچی سے مشورہ کیے بغیر اس کی شادی کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھ یا سات برس کی عمر میں نکاح کیا اور یہ نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد نے کیا تھا۔“

(الاستذکار 16/49-50)

امام احمد (المسائل 3/129)، امام مروزی (اختلاف العلماء 125)، علامہ ابن المنذر (الاجماع 91)، امام بغوی (شرح السنۃ 9/37)، امام نووی (شرح صحیح مسلم 9/206) اور حافظ ابن حجر عسقلانی (فتح الباری 12/27) جیسے جید اور مستند ائمۂ محدثین بھی اس ضمن میں یہی راے رکھتے ہیں۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں:

”عورت کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کی شادی نہیں کر سکتا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، اور اگر وہ اسے ناپسند کرے تو اسے نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، لیکن چھوٹی عمر کی کنواری بچی کی شادی اس کا والد کرے گا، اور اس (بچی) کو اجازت کا حق نہیں۔“

(مجموع الفتاویٰ 32/39)

دارالعلوم دیوبند سے جاری ہونے والے فتویٰ میں لکھا ہے:

”نابالغوں کا نکاح جو ولی کریں، صحیح ہے، نابالغوں کو سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ اولیا کا سمجھنا اور اجازت دینا کافی ہے، عمر کی کچھ تحدید لازمی نہیں ہے۔“ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند 7/48)

ان تمام آرا سے ہم یہ نتائج نکال سکتے ہیں:

اگرچہ اللہ کے رسول کا واضح فرمان ہے کہ عورت کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر وہ عورت ابھی بالغ نہیں ہوئی تو اس کا حقیقی والد اس کا نکاح اپنی مرضی سے کرا سکتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل وہ روایت ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سیدہ عائشہ سے نکاح بلوغت سے پہلے ہوا ہے، کیونکہ مشہور روایات کے مطابق اس وقت سیدہ عائشہ کی عمر 6 یا 7 برس ہی تھی اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

حضرت عائشہ نابالغ تھیں اور ان کے والد حضرت ابو بکر نے اپنی مرضی سے بیٹی کا نکاح کرایا

تھا، یوں ثابت ہوا کہ نابالغ بچی کا نکاح ہو سکتا ہے اور والد نابالغ بچی کا نکاح کرا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ نابالغ بچی کے نکاح کی دور رسالت میں سیدہ عائشہ کے نکاح کے علاوہ کوئی دوسری صحیح روایت نہیں ملتی۔

یہاں تک فقہا اور علما کا استدلال صرف اس روایت سے رہا ہے جس کا تعلق بہ قول متذکرہ علما کے براہ راست اللہ کے رسول کے اپنے عمل سے ہے۔ اور اس بات کی بھی تصریح ہے کہ ایسا کوئی فرمان بھی منقول نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ سیدہ عائشہ سے نکاح آپ نے بہ طور رسول کیا تھا اور اب کسی دوسرے مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔

قرآن سے استدلال کی تاریخ

آیئے، اب جائزہ لیتے ہیں کہ جو علما اس رائے کی بنیاد قرآن مجید کو مانتے ہیں، ان کا استدلال کیا ہے؟

ہماری علمی تاریخ یہی کہتی ہے کہ رخصتی اور جنسی تعلق کے لیے بھی بلوغت کی کوئی شرط ثابت نہیں، بلکہ اسے عین قرآن کے مطابق کہا جاتا ہے۔ ان علما کے استدلال کی بنیاد سورۂ طلاق (65) کی آیت 4 ہے، جہاں بیان کیا گیا ہے:

وَ الّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ.

”اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمھیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے اور یہی حکم اُن کا ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔“

اس آیت میں ’لَمْ یَحِضْنَ‘، یعنی جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو، کو بنیاد بنا کر مفسرین کی ایک کثیر تعداد نے جو رائے قائم کی ہے، ان میں بہت ہی چیدہ اور ہر دور کے جید مفسرین کی رائے ہم باری باری بیان کرتے ہیں:

تابعی قتادہ (وفات 118ھ) نے ’لَمْ یَحِضْنَ‘ (جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو) کی تشریح میں کہا:

”وہ باکرہ دوشیزائیں جو ابھی حیض کی عمر کو نہ پہنچیں۔“ (تفسیر در منثور مترجم 6/614)

دوسری صدی ہجری کے پہلے مفسرِ قرآن ابن جریر طبری (متوفی 310ھ) نے اس سے مراد ایسی نابالغ بچیاں ہی لیا ہے کہ جنھیں چھوٹی عمر کی وجہ سے ابھی تک حیض نہیں آیا اور دخول کے بعد طلاق ہوئی ہو۔ ان کے الفاظ میں:

وكذلك عدد اللائي لم يحضن من الجواري لصغر إذا طلقهنّ أزواجهنّ بعد الدخول.

امام بخاری (المتوفی 256ھ) نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے:

باب إِنْكَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَهُ الصِّغَارَ (آدمی اپنی نابالغ بچی کا نکاح کر سکتا ہے)۔

اس کے بعد سورۂ طلاق کی اسی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: {وَاللاَّئِي لَمْ يَحِضْنَ} فَجَعَلَ عِدَّتَهَا ثَلاَثَةَ أَشْهُرٍ قَبْلَ الْبُلُوغِ. (بخاری، رقم 5132)

”کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'وَاللاَّئِي لَمْ يَحِضْنَ'۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی بلوغت سے پہلے اس کی عدت تین ماہ مقرر کی۔“

امام طحاوی (متوفی 321ھ) نے بھی اس سے مراد وہ نابالغ بچیاں لی ہیں، جنھیں کم عمری کی وجہ سے حیض نہیں آیا:

و كانت الصغيرة التى لم تحض ازا طلقت فدخلت فى العدة. (احکام القرآن 2/402)

”اور جس بچی کو حیض نہ آیا ہو، اگر اسے طلاق ہو گئی تو وہ عدت میں داخل ہو گئی۔“

امام بغوی (متوفی 516ھ) نے بھی اس آیت کی تشریح میں یہی لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ چھوٹی بچیاں ہیں جنھیں ابھی حیض آیا ہی نہیں تو ان کی عدت بھی تین ماہ ہے:

يعنى الصغار اللائى لم يحضن فعدتهن أيضاً ثلاثة أشهر. (تفسیر معالم التنزیل 8/152)

پانچویں و چھٹی صدی ہجری کے ماہر لغت و کلام مفسر علامہ زمخشری (متوفی 538ھ) نے بھی یہی کہا ہے کہ جنھیں حیض نہیں آیا، کیونکہ وہ عمر میں چھوٹی ہیں:

واللئى لَمْ يَحِضْنَ هن الصغائر. (الکشاف 4/560)

ابن کثیر (متوفی 774ھ) نے بھی اس آیت کی تفسیر میں بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اس

سے وہ چھوٹی بچیاں مراد ہیں جو ابھی اس عمر کو پہنچی ہی نہیں کہ انھیں حیض آئے:

وکذا الصغار اللائی لم یبلغن سن الحیض. (تفسیر القرآن العظیم 8/149)

دورِ جدید میں بھی علما نے اس آیت کی تفسیر میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ اور واضح طور پر لکھا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں چھوٹی بچیوں کی مدت عدت بیان ہوئی ہے کہ جنھیں ابھی حیض نہیں آیا۔

مشہور سلفی عالم و مفسر شیخ عبد الرحمٰن ناصر السعدی اسی آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی چھوٹی لڑکیاں جن کو ابھی حیض نہیں آیا... ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔''

(تفسیر السعدی 870)

بریلوی مکتب فکر کے احمد یار خان نعیمی اپنی تفسیر ''نور العرفان'' میں ''جنھیں ابھی حیض نہ آیا'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''(یعنی) بچپن کی وجہ سے، ان کی عدت بھی تین مہینے ہے۔'' (891)

دیوبندی مکتب فکر کے مفتی محمد شفیع (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا:

''اور اس طرح جن عورتوں کو (اب تک بوجہ کم عمری کے) حیض نہیں آیا (ان کی عدت بھی تین مہینے ہے)۔'' (معارف القرآن 8/474)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس آیت کی تشریح میں 'لَمْ یَحِضْنَ' کی وضاحت کم سنی ہی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے، بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس بات کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا۔'' (تفہیم القرآن 5/571)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ مذکورہ بالا تمام مفسرین سورۂ طلاق کی اس آیت کے الفاظ سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

1۔ نابالغ بچی سے نکاح جائز ہے۔

2۔ چونکہ متذکرہ تمام مفسرین کے نزدیک حیض نہ آنے کی وجہ صرف عدم بلوغت ہی ہوتی

ہے، اس لیے یہ یقینی ہے کہ یہاں ایسی بچیوں کی عدت مقرر کی گئی ہے جن سے جنسی عمل ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن نے ایک دوسری جگہ واضح کیا ہے کہ غیر مدخولہ مطلقہ کی کوئی عدت نہیں ہے۔ سورۂ احزاب (33) آیت 49 میں ہے:

”ایمان والو، جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دیتے ہو تو ان پر تمھاری خاطر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم کوئی شمار کروگے۔“

3۔ قرآن نے ’لَمْ یَحِضْنَ‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس لیے ان الفاظ کا مطلب ہے کہ پہلے کبھی حیض نہیں آیا اور ایسی کیفیت صرف نابالغ بچی ہی کی ہو سکتی ہے، چنانچہ اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اس سے مراد نابالغ بچیاں ہی ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

اس رائے پر تین قوی اعتراض کیے جاتے ہیں:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ بات بالبداہت غلط ہے کہ حیض نہ آنے کی وجہ صرف عدم بلوغت ہے، کیونکہ ایسا کسی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور کسی عارضی رکاوٹ سے بھی۔ اس لیے یہ دلیل کافی نہیں کہ حیض نہ آنے کی وجہ محض کم سنی ہے۔ ایسی عورتوں کو بلوغت کے باوجود بھی حیض نہ آنے کی کوئی طبی وجہ ہو سکتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ فطرت کے خلاف ہے کہ نابالغ بچی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا جائے۔ شادی و نکاح کا سوال ہی تب ہوتا ہے جب فریقین بلوغت کو پہنچ جائیں۔ اور اس بات پر تمام فقہا اور علما متفق ہیں کہ نکاح کے بنیادی شرائط میں یہ شامل ہے کہ فریقین جملہ گواہوں کی موجودگی یا معنوی موجودگی میں اپنی رضامندی کا اظہار کریں۔ اب ایک نابالغ بچی، جسے نکاح کے معنی ہی معلوم نہ ہوں، وہ اپنی رضامندی کا اظہار کیسے کرے گی؟ اسی اصول کی بنیاد پر نابالغ بچوں پر نماز اور روزہ جیسے دینی فرائض واجب نہیں ہوتے۔ چنانچہ نابالغ بچی نکاح کے حقوق و فرائض کا کیا تصور کرے گی؟ دوسرے الفاظ میں، نابالغ بچی کو یہ کہا جائے گا کہ تمھیں نماز اور روزہ رکھنے کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تم پر فرض نہیں، لیکن حقوق زوجیت، البتہ ادا کرنا فرض ہے؟ سوال یہ ہے کہ جس بچی کو جنسی عمل کے بارے میں کوئی شعور ہی نہیں، وہ اسے پسند یا ناپسند کرنے کے

بارے میں کیا رائے دے سکتی ہے؟

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن نے سورۂ نساء میں جہاں یتیم بچوں کے مال کی حفاظت کا حکم دیا ہے، وہاں اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ ان کے مالوں کی اس وقت تک حفاظت کی جائے جب تک وہ بلوغت ہی نہیں، بلکہ رشد، یعنی سمجھ داری کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ سورۂ نساء (4) کی آیت 5 میں بیان ہوا ہے:

”اور (یتیم اگر ابھی نادان اور بے سمجھ ہوں تو) اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمھارے لیے قیام وبقا کا ذریعہ بنایا ہے، اِن بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو۔“

قرآن مجید کے اس حکم کے بعد یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ وہ نابالغ اور ناسمجھ بچوں کی شادی کا حکم دے سکتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یتیم بچوں کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ ان کی بلوغت ہی نہیں، بلکہ سمجھ داری کا یقین کرنے کے بعد ان کے مالوں پر انھیں تصرف کرنے کا حق دیا جائے۔ اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے نکاح کے بارے میں یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ مال کے لیے تو سمجھ داری ضروری ہے، لیکن جنسی تعلق قائم کرنے اور گھر بار کی ذمہ داری کے لیے نہ بلوغت کی ضرورت ہے، نہ سمجھ داری کی۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں ”یتیموں کا مال کب اُن کے حوالے کیا جائے؟“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”یہ وہ طریقہ بتایا ہے جو یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے معاملے میں سرپرستوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ یتیموں کو جانچتے رہو یعنی کوئی چھوٹی موٹی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان کرتے رہو کہ معاملات کی سوجھ بوجھ ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ نکاح کی عمر، یعنی بلوغ تک، ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھنا چاہیے۔“ (2/255)

چوتھا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ طبی طور پر یہ متفق علیہ ہے کہ نابالغ بچے تو اس عمل کے کسی صورت متحمل نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کے اعضا اس قابل ہی نہیں ہوتے۔ ان کی نفسیات اور جسمانی وجود اس کے برے اثرات سے کسی صورت نہیں بچ سکتے۔ اسی لیے بعض فقہا نے ”تحمل“ کی شرط کو بھی بیان کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں نابالغ بچی اس تشدد کی متحمل ہو گی اور فلاں نہیں؟ کیا اس عمل میں زخمی ہونے یا مستقبل میں طبی پیچیدگیوں کا اندازہ کسی

ماہر ڈاکٹر یا ماہر نفسیات کی راے جانے بغیر ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا عدم تحمل کا مطلب صرف جان لیوا ہونا ہی ہے؟ کیا اس عمل میں نابالغ بچی زخمی ہو جائے یا اس کی جان چلی جائے تو کیا شوہر پر کوئی دیت ہو گی؟

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ آیت میں تین مہینے کی عدت بیان ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگرچہ حیض نہیں آتا، لیکن شک اور امکان موجود ہے کہ حمل ٹھیر جائے۔ کیا نابالغ بچی کے بارے میں یہ امکان موجود ہو سکتا ہے کہ اسے حمل ٹھیر جائے گا؟ اس لیے یہ بات کسی صورت درست نہیں کہ قرآن مجید نے یہ عدت نابالغ بچی کے لیے بیان کی ہے۔ اسی بات کو مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”اسی بنیاد پر آئسہ غیر مدخولہ اور صغیرہ غیر مدخولہ کے لیے تو کسی عدت کی ضرورت نہیں ہے لیکن آئسہ یا صغیرہ، جس کو حیض نہ آیا ہو، اگر مدخولہ ہوں تو ان کے بارے میں چونکہ شبہ کا امکان ہے اس وجہ سے ان کے لیے عدت ہے۔“ (8/ 442)

مولانا اصلاحی کے مطابق عدت اس لیے بیان ہوئی ہے کہ کم عمر (نہ کہ نابالغ) لڑکیوں کے بارے میں یہ امکان موجود ہے کہ وہ پیٹ سے ہوں۔ اس شک کے امکان کو دور کرنے کے لیے ’ان ارۡتَبۡتُمۡ‘، یعنی اگر تمھیں شک ہے، کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے مولانا اصلاحی کے نزدیک ’لم یرضین‘ سے مراد عدم بلوغت نہیں، بلکہ ”کم عمری“ ہے۔

جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر

سورۂ طلاق کی آیت 4 کے حوالے سے جاوید احمد صاحب غامدی ایک منفرد نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ آیت کے زیر بحث حصے کا ترجمہ یہ کرتے ہیں:

> ”تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا، اُن کے بارے میں اگر کوئی شک ہے تو اُن کی عدت تین مہینے ہو گی۔“ (البیان 5/ 232)

یہ راے اختیار کرنے کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں:

> ”’وَالّٰٓئِۡ لَمۡ یَحِضۡنَ‘ کے الفاظ آئے ہیں اور ’لم‘ عربی زبان میں نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا

اِس سے وہ بچیاں مراد نہیں ہو سکتیں جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔‘‘(البیان 5/232)

یعنی عربی زبان میں نفی کے لیے عام لفظ ’ما‘ ہے، لیکن جب ’لم‘ کے لفظ کے ساتھ کسی فعل کے واقع ہونے کی نفی کی جاتی ہے تو اس میں شدت ہوتی ہے اور اس فعل کے امکان کو بھی رد کر دیا جاتا ہے، جیسے سورۂ اخلاص میں جب فرمایا گیا کہ ’لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ‘ تو اس امکان کی بھی پوری شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور نہ وہ باپ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح یہاں مطلب ہو گا کہ وہ عورتیں جنھیں نہ ماضی میں پہلے حیض آیا اور نہ مستقبل میں آئے گا۔ اب یہ صفت نابالغ لڑکیوں کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان کو بلوغت کے بعد لازمی یہ کیفیت پیش آئے گی۔ اب جب یہاں نابالغ بچیوں کی بات ہی نہیں ہو رہی اور زبان کے اصول کے لحاظ سے ایسا ہونا محال ہے تو لازمی طور پر یہاں ان عورتوں کا ذکر ہے جو اصل میں تو دائمی طور پر حیض کی کیفیت سے محروم ہیں۔ اسی لیے اس سے مراد یقیناً وہی عورتیں ہیں جو بڑی عمر، یعنی بالغ ہیں، لیکن کسی عارضے کی وجہ سے انھیں حیض نہیں آتا۔

یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہاں ایسی عورتیں مراد ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کبھی حیض نہیں آنا اور مدخولہ ہونے کے باوجود ان کو حمل کبھی نہیں ہو سکتا تو ان کی عدت مقرر کرنے کا کیا سبب ہے؟

اصل میں اللہ نے آیت میں بتا دیا کہ ’’اگر تمھیں شک ہو‘‘، یعنی شک کی نسبت انسانوں کی طرف کی ہے کہ تم میں سے کسی کو شک ہو گیا ہے تو اس کے لیے یہ تین مہینے مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ معاشرے میں محض شک کی بنیاد پر کسی فساد کا اندیشہ نہ رہے۔

صحابہ کا فہم

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ کسی بھی صحابی سے اس آیت کا یہ مفہوم منقول نہیں ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی صحابی کا یہ عمل کہیں بھی روایت نہیں ہوا کہ اس نے کسی نابالغ لڑکی سے شادی کی ہو۔ اس حوالے سے عملی طور پر صرف حضرت عائشہ صدیقہ ہی کی بلوغت سے پہلے نکاح اور رخصتی کی روایت ملتی ہے۔ اس روایت کے اوپر جو تنقیدات آ چکی ہیں، ان سے واضح ہوتا

ہے کہ یہ روایت درایتاً درست نہیں ہے اور مشہور ہونے کے باوجود اسے خبر واحد ہی کا درجہ حاصل ہے۔ اس حوالے سے متعدد اہل علم اور دور جدید کے محدثین نے ناقابل تردید شواہد سے یہ بات ثابت کی ہے کہ سیدہ عائشہ کی نکاح کے وقت عمر اٹھارہ یا انیس برس سے کسی طور کم نہیں تھی۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس فہم کی پہلی روایت تابعی قتادہ سے ملتی ہے۔ اور یہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دور میں سیدہ عائشہ صدیقہ کی چھ برس کی عمر میں نکاح کی روایت منظر پر آچکی تھی۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اگر قتادہ سے منسوب روایت درست ہے تو اس آیت کا یہ مفہوم اسی روایت کے زیر اثر لیا گیا ہے۔

اس غلط فہمی کی وجہ

آیت کے فہم میں غلطی کی بنیادی وجہ ہمارے نزدیک سیدہ عائشہ کی چھ برس والی روایت ہی ہے، کیونکہ جب کسی کام کی نسبت اللہ کے رسول سے بیان ہو کر عام ہو جائے اور اسے قبولیت و شہرت بھی حاصل ہو جائے اور وہ عام رواج، فطرت اور عقل کے خلاف بھی ہو تو اسے معقولیت دینے اور قابل قبول بنانے کے لیے کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب اس وقت کے معاشرے میں اس کی کوئی عملی مثال نہ ملی تو فقہا اور مفسرین نے اسے قرآن سے ثابت کرنے کی راہ ہموار کی۔ اس مقصد کے تحت نہ انھوں نے زبان کے متفقہ علیہ قواعد وضوابط کی پروا کی اور نہ فطرت اور بنیادی اخلاقیات کی کوئی رعایت کی۔ محض ایک مشہور روایت کو مان کر فقہ و شریعت کو بھی اس کے مطابق کرنے کی روش اختیار کی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سیدہ عائشہ سے نکاح کی روایت کے مشہور ہونے کے باوجود امت نے اس نکاح کو حضور کا اسوہ قرار دے کر اس پر عمل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ عالم اسلام کی کسی ثقہ شخصیت نے اس فعل کو حضور کی سنت کے طور پر بیان بھی نہیں کیا اور اس کی کوئی فضیلت اور اس پر عمل کرنے کی کوئی تبلیغ کبھی نہیں کی۔ کسی بھی دور میں، کسی بھی معاشرے میں، چاہے وہ عرب کا ہو یا عجم کا، نابالغ بچی سے نکاح کی کوئی روایت جنم نہ لے سکی۔ اور یہ بات بھی حقیقت ہے کی چند ایک مثالوں کو چھوڑ کر کسی بھی صاحب علم نے اس نکاح کو

حضور کے اختصاص میں بھی شامل نہیں کیا۔

کیا ماضی میں اس مفہوم کی کوئی مثال ملتی ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی اور مفسر یا صاحب علم نے اس آیت کا وہ مفہوم بیان کیا ہے جسے جاوید احمد غامدی نے سمجھا ہے؟ اس سوال کا جواب ہاں میں ہے۔ قدما میں قاضی عبد اللہ ابن شبرمہ اور ابو بکر الاصم اسی رائے کے حامل تھے۔ اہل تشیع علما کی ایک بہت بڑی اکثریت نے 'لم یحضن' سے نابالغ بچی مراد نہیں لیا۔ ''تفسیر نمونہ'' کے مولف آیت اللہ مکارم شیرازی نے سورۂ طلاق میں مذکورہ آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔''

اہل تشیع کے ایک دوسرے عالم محمد حسین نجفی اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''اور تمھاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر ان کے بارے میں تمھیں کوئی شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور یہی حکم ان عورتوں کا ہے جنھیں (باوجود حیض کے سن و سال میں ہونے کے کسی وجہ سے) حیض نہ آتا ہو اور حاملہ عورتوں کی میعاد وضع حمل ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔'' (909)

''تفسیر امین'' کے مفسر محمد امین اکبر سورۂ طلاق کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بہت سے لوگ اس آیت سے کم عمری میں شادی اور خلوت کے جواز کو ثابت کرتے ہیں۔ جن عورتوں کو حیض نہیں آتا کا ترجمہ ''حیض شروع نہیں ہوا'' کرتے ہیں، اصل لفظی ترجمہ ہے جن کو حیض نہیں آتا۔ یعنی پہلے حصے میں شک کی بات تھی اور یہاں یقین کی صورت میں حکم ہے۔ اس آیت کا کم عمری کی شادی سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بس حیض کے بارے میں شبہ، یقین اور حاملہ مطلقہ کی عدت کا بیان ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ عدت کی مدت کا تعین صرف حیض سے ہی نہیں ہو سکتا بلکہ حیض نہ آنے کی صورت میں ہو سکتا ہے اور اس صورت میں یہ مدت تین ماہ ہو گی۔ یہ آیت عورتوں یعنی النساء کے بارے میں ہے۔ عربی میں 'نساء' کا لفظ عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، کم عمر لڑکیوں کے لیے نہیں۔ کم عمر

لڑکیوں کو عربی میں "جاریہ" کہتے ہیں۔"

خلاصۂ بحث

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ:

1۔ سورۂ طلاق کی آیت 4 سے مشہور فہم کے بالکل برعکس یہاں پر ایسی خواتین کی عدت بیان ہوئی ہے جن کو حیض کی عمر کے باوجود حیض نہیں آیا۔

2۔ سورۂ نساء کی آیات 5 اور 6 سے یہ بات بالبداہت لفظوں میں بیان ہوئی ہے کہ شادی کے لیے نہ صرف بلوغت، بلکہ رشد، یعنی سمجھ داری بھی ضروری ہے۔

3۔ دور رسالت اور دور صحابہ اس بات سے خالی ہے کہ کسی نے قرآن مجید یا سنت رسول یا فرمان رسول سے یہ سمجھا اور بیان کیا ہو کہ نکاح کے لیے بلوغت کی کوئی شرط نہیں۔ یہ ایک فطری معاملہ ہے اور اسے ایک ثابت شدہ معاشرتی قدر کے تحت ہی سمجھا جائے گا۔ مسلمانوں کے ہر دور کی معاشرتی، سماجی اور قانونی روایت نے اسی کی تصدیق کی ہے۔ مزید یہ کہ اللہ کے رسول کا واضح اور متفقہ علیہ فرمان ہے کہ نکاح عورت و مرد کی رضامندی کے بغیر منعقد ہی نہیں ہوتا۔

4۔ یہ تاثر درست نہیں کہ اس معاملے میں علماے اسلام کا اجماع ہے کہ نکاح اور جنسی عمل کے لیے بلوغت کی کوئی شرط نہیں۔ اگرچہ علماے اہلِ سنت کی کثیر تعداد یہی راے رکھتی ہے، لیکن ماضی سے لے کر موجودہ دور تک ایسے علما ہمیشہ سے موجود رہے ہیں جو اس راے کے بالکل برعکس نکاح اور اس کے معمولات کے لیے بلوغت اور رشد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اسے عقل، فطرت اور شریعت کا عین تقاضا سمجھتے ہیں۔

محمد سعد سلیم

علاماتِ قیامت اور تاریخی واقعات:
بائیبل اور قرآن کی روشنی میں

(2)

مغرب سے سورج کا طلوع ہونا

احادیث میں قیامت کی بڑی نشانیوں میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا'' مختلف زبانوں اور ثقافتوں میں ایک استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جو کسی تہذیب کے اثر ورسوخ، طاقت اور عروج کی علامت ہے۔ اس استعارے میں سورج کا ذکر تہذیبوں کے عروج وزوال کے تاریخی ادوار کو نمایاں کرتا ہے، جہاں طاقت اور قیادت مختلف خطوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا عام طور پر اس تہذیب کے عروج کی علامت سمجھا جاتا ہے اور کسی تہذیب پر سورج کا غروب ہونا عام طور پر اس کے زوال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

علاماتِ قیامت کے تناظر میں، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی تشریح مغربی تہذیب کے عروج کے طور پر کی گئی ہے۔ یہ عروج کا سفر بارھویں صدی کے قرون وسطیٰ کے نشاۃِ ثانیہ سے شروع ہوا، جو یورپ میں فکری اور علمی بیداری کا دور تھا، جس میں یونانی اور عربی علوم کے تراجم کے ذریعے سے قدیم دانش کی بازیافت، سکولاسٹیک فلسفے کی ترقی، یونیورسٹیوں کا قیام اور قانون، سائنس، اور تعمیرات میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس دوران میں عوامی ادب میں ترقی،

مذہبی اصلاحات، اور صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ثقافتی تبادلوں نے یورپی تہذیب و دانش کی بنیادوں کو مزید مضبوط کیا۔ بعد میں چودھویں سے سترھویں صدی کی نشاۃِ ثانیہ اور سولھویں ویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان تحریکوں نے یورپ میں فکر، سائنس، اور طرز حکمرانی میں گہرے انقلابات برپا کیے، جو بالآخر مغرب کو ایک غالب عالمی طاقت کے طور پر قائم کرنے کا باعث بنے۔

زمین کے جانور کے ساتھ قربت

حدیث میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کو قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی کہا گیا اور زمین کے جانور کو اس کے فوراً بعد کی ایک بڑی نشانی کے طور پر بیان کیا گیا۔ مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی یہ نشانی دس بڑی نشانیوں میں سب سے پہلے پوری ہوئی۔ قرونِ وسطیٰ کے بارھویں صدی کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد زمین کا جانور، جس کی علامتی تشریح تیرھویں صدی میں منگول سلطنت ہے، کے نکلنے کا واقعہ رونما ہوا۔

ایمان لانے کا فائدہ نہ ہونا—ایک تنبیہ

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا تو لوگ اسے دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، لیکن اس وقت ایمان لانا بے سود ہو گا۔ بعض احادیث میں زمین کے جانور اور دجال کو بھی ان نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے جن کے ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا کسی نفع کا باعث نہیں ہو گا۔ اسی نوعیت کی ایک تنبیہ ہمیں سورۂ انبیاء میں یاجوج و ماجوج کے حوالے سے بھی ملتی ہے، جہاں لوگ یاجوج و ماجوج کی رکاوٹ ٹوٹنے کے بعد اعتراف کریں گے کہ "بے شک ہم ظالم تھے"۔

یہ احادیث اور قرآن کی آیت ایک واضح تنبیہ ہے، کیونکہ یہ نشانیاں قیامت کے قریب واقع ہوں گی۔ اور یہ قیامت کے دن کا منظر نامہ ہے کہ کسی شخص کا ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا اور لوگ اعتراف کریں گے کہ "بے شک ہم ظالم تھے"۔ یہ تنبیہ ان نشانیوں کے قیامت سے قریب الوقوع ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ نشانیاں قیامت سے کتنی قریب ہیں، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ پیغام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مہلت ختم ہونے سے قبل ایمان لے آئیں اور

خالص توبہ کے ذریعے سے اپنی اصلاح کر لیں، اس سے پہلے کہ رجوع کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔

دجال— جھوٹے مسیح کی آمد

دجال، جس کا مطلب ''بڑا جھوٹا'' ہے، کو 'المسیح الدجال' بھی کہا جاتا ہے، جس کا ترجمہ ''جھوٹا مسیح'' ہے۔ 'مسیح' (عبرانی مشیاح سے، جس کا مطلب ''مسح کیا گیا'' ہے) قدیم اسرائیل میں ان افراد کے لیے استعمال ہوتا تھا جو بادشاہ، نبی یا کاہن کے طور پر خدا کی طرف سے چنے جاتے اور تیل سے مسح کیے جاتے۔ وقت کے ساتھ، مسیح کا تصور محض ایک مسح شدہ فرد سے نجات دہندہ کے تصور میں تبدیل ہو گیا، جو تاریخی جدوجہد، نجات کی امیدوں اور مذہبی تشریحات کا نتیجہ ہے۔

اسی سیاق میں مسیح الدجال وہ ہستی ہے جو خود کو نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتی ہے اور انسانی فطرت میں موجود مصائب و مشکلات سے نجات کی امید سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ نجات کی طلب بہ ذات خود کسی مخصوص مذہبی پہلو کی حامل نہیں ہوتی۔ روایات کے مطابق، اس کی پیشانی پر ''کافر'' لکھا ہو گا، جو اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ دجال خدا کا منکر ہو گا، اور نتیجتاً اس کے وعدے کسی الہامی یا مذہبی بنیاد پر نہیں ہوں گے۔

زمین کے جانور کے برعکس، جو محض طاقت اور جبر کی علامت ہے، دجال انسانی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بعد کے ادوار میں بابلی سلطنت کو انسانی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دجال محض ایک عسکری قوت پر مبنی سلطنت نہیں، بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جو گم راہ کن عقائد کے ساتھ لوگوں کو اپنے جھوٹے وعدوں پر یقین دلاتی ہے۔

دجال کی شناخت

دجال کے ظہور سے پہلے کے واقعات

دجال کی آمد سے پہلے، متعدد احادیث میں مسلمانوں کی تاریخ کے چار اہم واقعات کا ذکر ملتا ہے، جو نہ صرف مسلم و عیسائی کشمکش کے بڑے سنگ میل ہیں، بلکہ امت کی اجتماعی آزمایش کا بھی

مظہر ہیں۔ یہ چار واقعات درج ذیل ہیں:

1۔ جنگ یرموک — جس میں مسلمانوں نے بازنطینی (رومی) سلطنت کو فیصلہ کن شکست دی۔

2۔ پہلی صلیبی جنگ کا معرکۂ انطاکیہ — جو شام کے شمالی علاقے میں پیش آیا اور صلیبی یلغار کا نقطۂ آغاز بنا۔

3۔ قسطنطنیہ کی فتح — جس کے ذریعے سے عثمانی ترکوں نے بازنطینی دارالحکومت پر مسلم پرچم لہرایا۔

4۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد عثمانی سلطنت کا زوال — جب خلافت نے اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اگرچہ ان واقعات کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، لیکن ان میں ایک گہرا ربط موجود ہے۔ پہلے تین واقعات کا تعلق رومی (بازنطینی) سلطنت سے ہے، جب کہ آخری تین واقعات میں ترک مسلمان نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، جو اناطولیہ میں آباد ہو کر اسلامی دنیا کا عسکری و سیاسی مرکز بنے۔

رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی جنگ—جنگ یرموک (636ء)

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شدید جنگ شام سے آنے والی فوج سے ہو گی، جس میں مسلمان شہادت یا فتح کے عزم کے ساتھ لڑیں گے۔ ابتدائی تین دنوں کی لڑائی میں دونوں فریق سخت نقصان اٹھائیں گے، مگر کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکلے گا۔ چوتھے دن مسلمانوں کا دستہ دشمن کو شکست دے گا۔ جنگ اتنی خوف ناک ہو گی کہ فضا میں اڑنے والا پرندہ بھی اس کے اثرات سے بچ نہ سکے گا۔ آخر میں، اتنے زیادہ لوگ قتل کیے جائیں گے کہ جنگ کے بعد گنتی کی جائے گی تو سو میں سے صرف ایک شخص زندہ بچے گا۔

یہ واقعہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے جلد ہی بعد پیش آنے والے عظیم الشان معرکہ—جنگِ یرموک—کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو شام کے بازنطینی عیسائیوں کے خلاف

لڑی گئی۔ یہ جنگ چھ دنوں تک جاری رہی، جن میں پہلے دن ابتدائی جھڑپیں اور حالات کا جائزہ لینے کی کوششیں ہوئیں، جب کہ پانچویں دن بازنطینیوں کی طرف سے جنگ بندی کی پیشکش اور آخری معرکے سے پہلے از سرِ نو صف بندی کی گئی۔ اسی لیے حدیث میں صرف چار دنوں کی شدید لڑائی کا ذکر آیا ہے۔

دوسرے، تیسرے اور چوتھے دن سخت ترین معرکے دیکھنے میں آئے، جن میں جانی نقصان بھی غیر معمولی تھا۔ ان دنوں میں مسلمان افواج کی صفوں کو مجتمع رکھنے اور دشمن کے شدید دباؤ کو روکنے میں برق رفتار گھڑ سواروں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر کلیدی کردار ادا کیا۔ ان میں خصوصاً حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور اُن کے چار سو جان نثار مجاہدین شامل تھے، جنھوں نے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی حکمتِ عملی اپنائی—جو حدیث میں مذکور 'شرطۃ الموت'، یعنی موت کے دستے کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

چھٹے دن—جو حقیقی معنوں میں شدید لڑائی کا چوتھا دن تھا—مسلمانوں نے فیصلہ کن حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم برداروں کو شان دار فتح عطا فرمائی، اور بازنطینی افواج مکمل طور پر پاش پاش ہو گئیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو بھی بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ میدان جنگ کے اوپر پرندوں کا نہ گزر سکنے کی تفصیل میدانِ جنگ میں تیروں کی بارش اور گرد و غبار کے اٹھنے کو ظاہر کرتا ہے، جو جنگ کی شدت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ جنگ تاریخ عالم کے ایک اہم موڑ کے طور پر دیکھی جاتی ہے، جس نے شام میں مسلمانوں کے غلبے کی بنیاد رکھی۔

رومیوں کا دابق یا اعماق میں اترنا اور مسلمانوں سے لڑنا—پہلی صلیبی جنگ کا معرکہ انطاکیہ (1098ء)

حدیث میں رومیوں کا دابق یا اعماق میں اترنا، مدینہ سے بہترین سپاہیوں پر مشتمل فوج کا ان کے مقابلے کے لیے آنا، رومیوں کا مسلمانوں کے قبضے سے جنگی قیدیوں کو چھڑانے کا مطالبہ اور ایک تہائی مسلمانوں کا فرار، ایک تہائی کا شہید ہونا اور ایک تہائی مسلمانوں کا کبھی آزمایش میں نہیں ڈالا جانا بیان کیا گیا ہے۔

یہ منظر نامہ تاریخ میں پہلی صلیبی جنگ کے دوران میں واضح طور پر سامنے آیا، جب بازنطینی سلطنت نے سلجوقی ترکوں کے خلاف فوجی مدد کے لیے یورپی عیسائی طاقتوں کو پکارا۔ اس جنگ کا ایک بڑا مقصد، عیسائیوں کے مقدس مقامات ــــ بالخصوص یروشلم ــــ کو مسلمانوں کے قبضے سے ''آزاد'' کرانا تھا۔ احادیث میں صلیبیوں کے ان عزائم کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے، گویا ان کے نزدیک یہ مقدس مقامات مسلمانوں کی قید میں تھے، جنھیں وہ ہر قیمت پر بازیاب کرانا چاہتے تھے۔

پہلی صلیبی جنگ میں صلیبیوں نے اناطولیہ میں فتوحات کے بعد شمالی شام کا رخ کیا۔ ان کا پہلا بڑا ہدف انطاکیہ تھا، جو اس خطے کا ایک مرکزی اور کلیدی شہر تھا۔ شمال کی جانب سے انطاکیہ تک پہنچنے کے لیے وہ اعماق کے علاقے سے گزرے، جو حدیث میں مذکور ہے۔

انطاکیہ پر صلیبیوں کے قبضے کے بعد، موصل کے اتابک، ترک سپہ سالار کربوغا کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر انطاکیہ کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ یہ فوج مسلمانوں کے مشہور اور تجربہ کار جنگ جو گروہوں پر مشتمل تھی۔ مسلم مورخ ابن الاثیر کے مطابق، یہ لشکر پہلے دابق میں پڑاؤ ڈالتا ہے، اور پھر انطاکیہ کی طرف بڑھتا ہے۔ حدیث میں جس ''مدینہ سے نکلنے والی فوج'' کا ذکر ہے، وہ دراصل مسلمانوں کی افواج کی علامت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ منورہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا اور لشکر وہیں سے روانہ ہوا کرتے تھے۔

حدیث کے مطابق مسلمانوں کے تین گروہوں کا ذکر ملتا ہے:

1۔ ایک تہائی وہ جو میدانِ جنگ سے فرار اختیار کریں گے: ابن الاثیر بیان کرتے ہیں کہ جنگ کے دوران میں تقریباً پوری مسلمان فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، سوائے ایک چھوٹے سے دستے کے۔ حدیث کے مطابق یہ فرار کی راہ اختیار کرنے والا گروہ ہے جسے اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

2۔ ایک تہائی وہ جو شہید ہوں گے: ابن الاثیر کے مطابق ایک چھوٹے سے دستے کے مجاہدین، جو سرزمینِ مقدس سے تعلق رکھتے تھے، ثابت قدم رہے اور انھوں نے اللہ کی رضا اور شہادت کی طلب میں لڑائی جاری رکھی۔ صلیبی فوج نے ان میں سے ہزاروں کو شہید کر دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں حدیث میں 'افضل الشھداء'، یعنی ''سب سے بہترین شہدا'' قرار دیا گیا ہے۔

3۔ اور ایک تہائی وہ جنھیں آزمایش میں کبھی ڈالا ہی نہیں جائے گا، یعنی وہ ترک مسلمان

جنھوں نے صلیبی جنگوں میں حصہ نہیں لیا۔

یہ تقسیم انطاکیہ کی لڑائی میں مسلمانوں کی شکست کی علامت ہے۔

اس جنگ کے اثرات تاریخ پر بہت گہرے رہے، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد اور عسکری قوت صلیبیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ تاہم، اس غیر متوقع شکست نے صلیبیوں کو مزید حوصلہ دیا، جس کے نتیجے میں وہ 1099ء میں یروشلم پر حملہ آور ہوئے اور بالآخر اسے فاطمیوں سے چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔

مسلمانوں کا قسطنطنیہ کو فتح کرنا (1453ء)

حدیث میں ایک تہائی مسلمانوں کا بعد میں جیت جانا اور قسطنطنیہ کو فتح کرنا، جنھیں آزمایش میں کبھی نہیں ڈالا گیا، ان ترک مسلمانوں کی نمایندگی کرتا ہے جنھوں نے پہلی نو صلیبی جنگیں (1096ء-1272ء)، جو بنیادی طور پر عیسائیوں کے مقدس مقامات کے حصول کے لیے لڑی گئیں، کے دوران میں صلیبی جنگوں میں حصہ نہیں لیا۔ اس گروہ نے سلطنت عثمانیہ کے تحت 1453ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمانوں کا تلواریں لٹکانا اور دجال کا ظہور— عثمانی سلطنت کا ہتھیار ڈالنا (1918ء) اور سوویت یونین کا قیام (1922ء)

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ جب تلواریں زیتون کے درختوں پر لٹکا کر مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جا رہا ہو گا، شیطان پکارے گا: ”مسیح تمھارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے۔“ یہ خبر سن کر مسلمان روانہ ہوں گے، لیکن یہ جھوٹ ہو گا۔ پھر جب وہ شام پہنچیں گے اور جنگ کے لیے صف بندی کر رہے ہوں گے، عین اسی وقت دجال نمودار ہو جائے گا۔

یہاں ”تلواریں درختوں سے لٹکانے“ سے مراد 1918ء میں معاہدۂ مدروس کے تحت عثمانی سلطنت کا ہتھیار ڈالنا ہے، جب کہ ”مالِ غنیمت کی تقسیم“ درحقیقت فاتح قوتوں—برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونان—کے درمیان عثمانی علاقوں اور وسائل کی تقسیم کی علامتی تعبیر ہے۔

انھی ایام میں کمیونزم ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرا اور 1920ء میں آذربائیجان، آرمینیا اور عثمانیوں کے کئی سابقہ علاقوں پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جسے حدیث میں شیطان کی پکار ''مسیح تمھارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے'' کے ذریعے سے علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شیطان کی جانب سے مسیح کے ظہور کا یہ جھوٹا اعلان دراصل اُس کمیونسٹ پروپیگنڈے کی نمایندگی کرتا ہے، جس کے ذریعے سے کمیونسٹ ریاست کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا—ایسی ریاست جو عوام کو سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ استحصال سے ''رہائی'' دلانے اور مزدوروں وکسانوں کے لیے ''برابری'' اور سوشلسٹ نظام کی شکل میں ایک مثالی معاشرتی خواب کو حقیقت بنانے کا دعویٰ کر رہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شام عیسائیوں کے زیرِ تسلط تھا، لہٰذا مسلمانوں کا شام پہنچنا علامتی طور پر 1920ء میں معاہدۂ سیور کے تحت یورپی عیسائی فاتحین کے عثمانی سلطنت کے علاقوں پر باضابطہ قبضے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح، احادیث میں بیان کردہ مسلمانوں کی ''صف بندی'' ترکی میں ایک نئی سیاسی ترتیب کے قیام کی علامت ہے۔ نومبر 1922ء میں ترکی کی قومی اسمبلی نے باضابطہ طور پر عثمانی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کیا اور اسی دوران میں، دسمبر 1922ء میں، سوویت یونین کا قیام عمل میں آیا—یہ وہی لمحہ تھا جب روایات کے مطابق دجال کا ظہور ہوا۔

مسلمانوں کے دس گھڑ سوار—ترکی کی قومی تحریک کے دس رہنما

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان دجال کی خبر سنیں گے تو وہ ہر چیز چھوڑ کر دس گھڑ سواروں کو طلیعہ (پیش رو دستہ) کے طور پر روانہ کریں گے۔ یہ منظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ''کتابِ مکاشفہ'' میں بیان کردہ گھڑ سواروں کی مانند ہے، جہاں گھڑ سوار قیادت اور رہنمائی کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

مذکورہ حدیث میں بھی ان دس گھڑ سواروں سے مراد مسلمانوں کے دس رہنما ہیں۔ ان کی تعبیر ترکی کی قومی تحریک کی وہ دس نمایاں سیاسی و عسکری شخصیات ہیں جنھوں نے ابتدا میں کمیونسٹوں اور بعد ازاں مغربی طاقتوں سے کامیاب مذاکرات کیے۔ حدیث میں ان کو اس دن کے

بہترین گھڑ سوار بتایا گیا ہے، جو در حقیقت بہ طور سفارت کار اور رہنما ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان میں خاص طور پر مصطفیٰ کمال اتاترک، یوسف کمال ٹینگیر شینک، کازم کارابیکر اور بعد میں عصمت انونو جیسے رہنماؤں نے بے مثال سفارتی مہارت کا مظاہرہ کیا اور کمیونسٹوں اور مغربی طاقتوں، دونوں سے بہترین معاہدے حاصل کیے۔ 1921ء میں ترکی کی قومی تحریک نے کمیونسٹوں کے ساتھ سرحدوں کے تعین اور مالی امداد اور عسکری حمایت پر معاہدے کیے، لیکن تحریک کے رہنماؤں نے ترکی کو کمیونزم کے نظریاتی اثر سے محفوظ رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں 1923ء میں معاہدۂ لوزان کے ذریعے سے مغربی طاقتوں سے مکمل خود مختاری حاصل کی اور عثمانی سلطنت کے برعکس ترکی کو نو آبادیاتی تسلط سے بچایا۔ یہ ایک نادر سفارتی کامیابی تھی، جس میں ترکی نے دونوں عالمی طاقتوں سے فائدہ اٹھایا، مگر کسی کا تابع نہیں بنا۔

بنی اسحٰق کے ستر ہزار افراد—باکو شہر کے شیعہ مسلمان (1918ء-1920ء)

حدیث میں ایک ایسے شہر کا ذکر ملتا ہے جس کی ایک سمت خشکی اور دوسری سمت سمندر ہے۔ بنی اسحٰق کے ستر ہزار افراد بغیر اسلحہ کے اس شہر پر حملہ کریں گے اور 'لا إله إلا الله والله اكبر' کے تین بار کہنے کے بعد یہ شہر ان کے لیے کھل جائے گا۔ شہر پر قبضے کے بعد وہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے بعد اسے تقسیم کریں گے، لیکن دجال کے ظہور کی خبر سنتے ہی لوٹ جائیں گے۔

اس حدیث کی تعبیر موجودہ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو کے 15/ ستمبر 1918ء کے واقعات ہیں۔ یہ شہر بحر خزر کے کنارے واقع ہے—ایک طرف خشکی اور دوسری طرف سمندر۔ اس پیشین گوئی میں شیعہ مسلمانوں کو علامتی طور پر ''بنی اسحٰق'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح بنی اسحٰق، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک علیحدہ مذہبی شناخت رکھتے تھے، اسی طرح شیعہ مسلمان بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے اندر ایک مسلکی امتیاز کے حامل گروہ کے طور پر سامنے آئے۔ حدیث میں بنی اسحٰق کی ''ستر ہزار'' کی تعداد کا ذکر دراصل اُس وقت باکو میں موجود شیعہ آبادی کی طرف

اشارہ ہے، جو تقریباً ستر ہزار کے قریب تھی۔

تاریخی طور پر باکو میں 15/ ستمبر 1918ء کو عید الاضحیٰ کا دن تھا، جب پہلی جنگ عظیم کے دوران میں عثمانی افواج باکو میں داخل ہوئیں۔ برطانوی اور آرمینیائی افواج ایک رات قبل ہی باکو کا انخلا کر چکی تھیں، جس کے باعث عملی طور پر شہر کا دفاع ختم ہو چکا تھا۔ حدیث میں ذکر کردہ 'لا إله إلّا الله والله أكبر' کے الفاظ اس دن عید الاضحیٰ کی مناسبت سے ایامِ تشریق کی تکبیروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ حدیث کے مطابق تین مرتبہ یہ کلمات کہے جانے کے بعد شہر کا ''کھل جانا'' علامتی طور پر عید الاضحیٰ کے تیسرے دن، مقامی شیعہ آبادی کی نمایندہ آذربائیجان ڈیموکریٹک ریپبلک کی جلاوطن قیادت کا واپس آنا اور باکو میں 17/ ستمبر 1918ء کو باقاعدہ اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔

حدیث میں مذکور ''مالِ غنیمت'' سے مراد اُس دور میں باکو کے وسیع تیل کے ذخائر ہیں، جن پر آذربائیجان ڈیموکریٹک ریپبلک کی شیعہ مسلمان قیادت کو عارضی طور پر کنٹرول حاصل ہوا۔ اس قیادت نے ان وسائل کو اقتصادی اور سفارتی مقاصد کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، اپریل 1920ء میں جب بالشویک کمیونسٹ افواج نے باکو پر حملے کی دھمکی دی تو یہ قیادت اپنی مختصر خود مختاری اور حاصل شدہ وسائل چھوڑ کر واپس جلاوطنی میں چلی گئی، جو حدیث میں دجال کے ظاہر ہونے کی خبر سن کر واپس پلٹنے کی تعبیر ہے۔

[باقی]

تحریر و تحقیق: علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی
ترتیب و تدوین: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

پہلے کون سی سورہ نازل ہوئی؟

[مختارات کا حصہ قدیم و جدید مصنفین کی منتخب تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مقصد ماضی اور حال کے فکر و نظر کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں ماضی کے نمایندہ اہل علم کی تصانیف سے ایسے اقتباس نقل کیے جاتے ہیں، جو ان کے افکار اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی موثر اور معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اِس حصے کے مندرجات سے مدیر اور ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

سیرت و تفسیر اور کتب حدیث میں عام طور پر یہی چیز معروف و مشہور ہے کہ نزول کے اعتبار سے سب سے پہلی وحی سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، جب کہ بخاری ہی میں اس کے متعلق حضرت جابر کی حدیث سب سے پہلی وحی سورۂ مدثر کی پہلی آیات کو بتاتی ہے۔ روایت یہ ہے:

قال البخاری: حدثنا یحی ثنا وکع عن علی بن المبارك عن یحی بن أبی کثیر قال: سألت أباسلمة بن عبد الرحمن عن أول مانزل من القرآن قال: یاایھا المدثر قلت

يقولون اقرأ باسم ربك الذی خلق؟ فقال أبو سلمه سألت جابر بن عبد اللّٰه عن ذلك وقلت له مثل الذی قلتَ فقال جابر لا أحدثك الا بما حدثنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: جاورت بحراء فلما قضیت جواری استبطنت فنودیتُ فنظرت عن یمنی فلم أر شیئًا ونظرت عن شمالی فلم أر شیئًا ونظرت أمامی فلم أر شیئًا ونظرت خلفی فلم أر شیئًا فرفعت رأسی فرأیت شیئًا فاتیت خدیجة فقلت دثرونی وصُبوا علیّ ماءً باردًا قال فدثرونی وصبوا علیّ ماءً باردًا قال فنزلت: یا أیها المدثر قم فأنذر وربك فكبر. (بخاری، رقم 732)

یعنی یحییٰ بن ابی کثیر نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے پوچھا کہ سب سے پہلے کون سی سورہ نازل ہوئی؟ انھوں نے کہا کہ المدثر۔ یحییٰ نے کہا کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ علق پہلے نازل ہوئی؟ کہنے لگے میں نے حضرت جابر سے یہی سوال کیا تھا اور ان کے جواب پر ان سے یہی بات کہی تھی جو تم نے کہی تو انھوں نے کہا تھا کہ میں تو وہی بیان کر رہا ہوں جو رسول اللہ نے بیان کیا۔ جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں غارِ حرا میں جا کر معتکف ہوا اور اللہ کے ذکر و عبادت میں لگ گیا۔ مدتِ اعتکاف ختم ہوئی (اس مدت کو اوزاعی نے ایک ماہ بتایا ہے) تو گھر واپس ہوا، پہاڑ سے اتر کر بطیف وادی میں پہنچا تو یکایک کسی پکارنے والے کی آواز آئی جو مجھے پکار رہا تھا۔ اِدھر اُدھر اور آگے پیچھے دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ آگے بڑھا تو پھر آواز آئی پھر دیکھا تو کوئی دکھائی نہ دیا۔ آگے بڑھا تو پھر صدا آئی اور محسوس ہوا کہ اوپر کی جہت سے آئی ہے۔ تب میں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا تو میں نے کچھ دیکھا اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ زمین پر گر گیا۔ ہوش آیا تو کپکپاتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ گھر آ کر حضرت خدیجہ سے کہا مجھے کپڑا اوڑھا دو، کپڑا اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ کپڑا اوڑھا دیا گیا۔ اسی حالت میں مجھ پر یہ آیات نازئی ہوئیں: 'یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ'۔ شارحین حدیث دونوں حدیثوں میں تطبیق دیتے ہیں کہ حضرت جابر والی حدیث کی دوسری روایات جن میں اور تفصیل آئی ہے اور جو خود بخاری میں، مسلم میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں ان سے متعین ہو جاتا ہے کہ سورۂ مدثر والا واقعہ فترۃ وحی کے بعد کا ہے۔

مصحف میں سب سے پہلے سورۂ فاتحہ درج کی گئی ہے، جس کو ام القرآن اور فاتحۃ الکتاب

کہا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معروف و مشہور ہے کہ سورۂ فاتحہ میں بندے جو دعا کرتے ہیں: 'اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ' (ہمیں سیدھی راہ دکھا) تو اسی دعا کا جواب پورا قرآن پاک ہے۔

چنانچہ پورا قرآن صاحب "تدبر قرآن" کے لفظوں میں "درحقیقت اسی سورۂ فاتحہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی شجرہ طیبہ کے برگ و بار ہیں جو قرآن کے پورے تیس پاروں میں پھیلے ہوئے ہیں"۔[1] اسی سے ملتی جلتی بات مفسر قرآن جناب جاوید احمد غامدی نے بھی لکھی ہے کہ "مضمون کے لحاظ سے ان (فاتحہ سے المائدہ تک کی سورتوں) کا باہمی تعلق دعا اور جواب دعا کا بھی ہے اور اجمال و تفصیل کا بھی۔"[2]

اس سلسلہ میں مفسر قرآن علامہ میرٹھی کی تحقیق یہ ہے کہ بدء وحی سے متعلق جو احادیث آئی ہیں، وہ صحیح و ثابت ہیں، مگر ان میں راوی زہری نے اپنی طرف سے ادراج کر دیا ہے اور بہت سی باتیں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں۔ علامہ میرٹھی کا خیال ہے کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کی جگہ 'اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ' کہنا زہری کی بھول ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ تحقیق ان کے اپنے الفاظ میں ترتیب میں تھوڑے تغیر کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"سورۂ علق کی ابتدائی آیات کو نزول کے اعتبار سے قرآنِ کریم کی اولین آیات سمجھا گیا ہے: 'اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ' تک کو اس کی پہلی قسط مانا جاتا ہے۔ 'كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى' سے آخر تک دوسری قسط ہے، جو سورۃ الاعلیٰ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ قسط اول کے نزول میں اولین آیات قرآن ہونا حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے۔ آغازِ وحی سے متعلق یہ حدیث ام المومنین نے اپنے بھانجے عروہ بن زبیر کو سنائی تھی اور عروہ نے ابن شہاب، یعنی محمد بن مسلم زہری کو بتائی تھی۔ یہاں میں یہ پوری حدیث ضروری تشریح کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کو دینا چاہتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے آغازِ وحی کا جو قصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا،

---

[1]۔ تدبر قرآن 1/76۔

[2]۔ البیان 1/14۔

اسے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے: 'اول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحی الرؤیا الصادقة فی النوم فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح'۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ آپ خواب میں جو بات دیکھتے، دن کے اجالے کی طرح واقعہ بن کر ظہور میں آجاتی تھی۔

(شرح) امورِ غیب کا حصول بیداری کی بہ نسبت خواب میں سہل و آسان ہے۔ انبیاے کرام پر اللہ کی وحی خواب میں بھی آتی تھی۔ اسے 'وَحی مَنامِی' کہتے ہیں اور بیداری میں جو بھی نازل ہوتی تھی وہ بے حد ثقیل و گراں گزرتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں 'وَحی مَنامِی' سہل و خفیف ہوتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز سہل و خفیف قسم سے کیا گیا تاکہ آپ کو امورِ غیب کے ادراک و تحصیل کی مشق ہو جائے۔ عالم غیب سے مسلسل رابطہ رہنے کی وجہ سے تحمل وحی کی عادت پڑ جائے اور بیداری میں نازل ہونے والی وحی کا ثقل برداشت کرنے کی طاقت و صلاحیت حاصل ہو جائے۔ خفیف سے آغاز کر کے بہ تدریج ثقیل کی طرف منتقل ہونا معقول و فطری چیز ہے۔ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر 'وَحی مَنامِی' کا سلسلہ چھ ماہ رہا ہے۔ بنابریں وحی منامی کا آغاز ماہِ ربیع الاول میں ہوا تھا جب آپ کی عمر چالیس سال ہو گئی تھی اور بیداری کی وحی کا آغاز ماہِ رمضان میں ہوا تھا (فتح الباری 1/26)۔

'وَحی مَنامِی' کا سلسلہ شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد دنیا و اہل دنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصروفِ عبادت رہنا آپ کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ چنانچہ ام المومنین فرماتی ہیں: 'ثم حبب اليه الخلاء فكان يخلو بغار حراء فيتحنث فيه الليالی ذوات العدد قبل ان يرجع الى اهله و يتزود لذلك. ثم يرجع الى خديجة فيتزود لمثلها حتى جاءه الحق وهو فی غارِ حراء'۔ اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے: 'حتى فجئه الحق وهو فی غار حراء فجاءه الملك فيه' (کتاب التعبیر، رقم 6982)۔

یعنی آپ کوہِ حرا کے ایک غار میں خلوت گزیں رہنے لگے۔ تسلسل کے ساتھ کئی کئی دن رات وہاں اللہ کی یاد و عبادت میں بسر فرماتے۔ گھر سے لایا ہوا توشہ ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور توشہ لے کر پھر چلے جاتے، یہاں تک کہ غارِ حرا میں اچانک آپ کے سامنے امر حق آ گیا۔

(شرح) حقیقت یہ ہے کہ سن شعور کو پہنچنے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت روزِ

روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اہل مکہ کا مذہب شرک و بت پرستی قطعاً باطل ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے اعمال و رسوم سب واہیات ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی زبانی آپ نے سنا تھا کہ ہم لوگ اسمٰعیل بن ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ اور یہ کہ وہ دونوں باپ بیٹے بڑے نیک اور اچھے انسان تھے۔ اللہ سے بے حد محبت رکھنے والے۔ دونوں نے خانہ کعبہ اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا، مگر ان کا اصل مذہب باقی نہیں رہا۔ جوں جوں آپ کی عمر بڑھی آپ کو اصل دین ابراہیم کی کھوج پڑی، مگر اس کا کما حقہٗ سراغ نہ مل سکا۔ عبادات میں بس تسبیح، تحلیل، تکبیر اعتکاف، روزہ اور حج دین ابراہیم کے باقی ماندہ آثار تھے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھی کے مطابق اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی عبادت فرماتے رہے۔ اللہ کی محبت کے نور سے آپ کا سینہ معمور تھا ہی۔ جب 'وَحی مَنامِی' کے سلسلہ نے آپ کا عالم غیب سے اٹوٹ تعلق قائم کر دیا تو اللہ کی بندگی و پرستاری و محبت کے غلبہ نے آپ کو دنیا و اہل دنیا سے بالکل منقطع کر دیا اور آپ دس دس دن رات مسلسل غارِ حرا میں اللہ کی یاد و عبادت میں مصروف رہنے لگے۔ اس حدیث میں اگرچہ دس کا عدد مذکور نہیں ہے، لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد نبوت ہر سال رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے تو اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ کا اعتکاف دس شبانہ روز کا ہی ہوتا تھا۔ اور یہ جو اس حدیث میں 'فجاءہ الحق' آیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فرشتہ نہ دیکھا تھا، نہ آپ کو اس کا کچھ علم تھا۔ ہاں، تو یکایک ایک رات غارِ حرا میں ہی ایک شخص نے جو فی الواقع فرشتہ تھا جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، آکر آپ سے کہا: 'اِقْرَأْ'، اس لفظ کے معنی ہیں "پڑھ"۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

فجاءہ الملك فقال اقرأ. قال فقلت ما انا بقارئ. فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال: اقرأ، ما انا بقارئ فاخذنی فغطنی الثانیة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال: اقرأ، فقلت: ما انا بقارئ فاخذنی فغطنی

"چنانچہ فرشتہ آیا اور کہا کہ پڑھیے، میں نے فرشتے کے جواب میں کہا: "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" یعنی اُمی ہوں، لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ میرا جواب سن کر اس نے مجھے باہوں میں جکڑ کر خواب زور سے بھینچا کہ میرا بدن چور چور ہونے لگے۔ پھر چھوڑ کر بولا: 'اِقْرَأْ' میں نے پھر عذر کیا

الثالثة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال ''اقرأ باسم ربك... الی. مالم یعلم'.

کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تب اس نے مجھے پکڑ کر دوبارہ خوب زور سے بھینچا کہ مجھے بڑی مشقت محسوس ہوئی پھر چھوڑ کر کہا: 'اِقْرَأْ' میں نے پھر اَن پڑھ ہونے کا عذر کیا۔ تب اس نے تیسری بار مجھے پکڑ کر خوب زور سے بھینچا پھر چھوڑ کر کہا: 'اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ'۔''

(تشریح) وہ اجنبی شخص اللہ تعالیٰ کا مقرب و معزز فرشتہ جبریل امین تھا، مگر اُس وقت اُس نے اپنا تعارف نہیں کرایا، نہ یہ بتایا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں اور یہ کلمات جو آپ کو تلقین کر رہا ہوں، اللہ کے کلمات ہیں۔ اُس غار میں تو اب تک آپ کے پاس کوئی شخص دن میں بھی نہ آیا تھا۔ اہل مکہ شاید جانتے بھی نہ تھے کہ آپ اس غار میں خلوت گزیں رہا کرتے ہیں۔ پس جنگل میں اندھیری رات میں اس خلوت گاہ کے اندر کسی اجنبی شخص کا یکایک گھس آنا تعجب اور گھبراہٹ میں ڈال دینے والا واقعہ تھا۔ پھر اس کا پکڑ پکڑ کر آپ کو زور زور سے بھینچنا اور آپ کو تعجب و مشقت میں ڈال دینا ایک طرف اس کی دلیل تھا کہ وہ نہایت قوی و زور آور ہے۔ دوسری طرف سخت حیرت انگیز بھی تھا کہ آخر وہ آپ کے اَن پڑھ ہونے کے عذر کو کیوں نہیں سنتا۔ دراصل حضرت جبریل نے آتے ہی یہ آیتیں آپ کو تلقین کرنا شروع کر دی تھیں۔ لفظ اول 'اِقْرَأْ' کہا تو آپ سمجھے کہ یہ شخص مجھ سے پڑھنے کو کہہ رہا ہے۔ اسی لیے عذر میں فرمایا: ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' آخر تین بار آپ کو زور زور سے بھینچنے کے بعد آپ کو پورا کلام تلقین کیا، تب آپ کو پتا چلا کہ 'اِقْرَأْ' تو اس کلام کا لفظ اول ہے جو اس نے مجھے تلقین کیا ہے۔ تعجب ہے کہ صحیحین کے شارحین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور وہ 'اِقْرَأْ' کی دور از کار توجیہات میں جا پڑے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت جبریل نے اُس وقت آپ کو صاف صاف کیوں نہیں بتایا کہ میں اللہ کا

فرستادہ جبریل ہوں۔ اللہ نے آپ کو نبی بنایا ہے۔ میں اُس کا کلام آپ کے پاس لایا ہوں؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کا یہ حکم نہ ہوا تھا۔ اس وقت آپ کو حیرت و دہشت اور تدبر و تفکر میں ہی ڈالنا مقصود تھا۔ فرشتہ آپ سے وہی کہہ سکتا تھا جو اسے کہنے کا حکم ہوا تھا۔

رہا جبریل کا آپ کو تین بار زور سے بھینچنا تو اس کی سیدھی سادی توجیہ تو یہ ہے کہ اس کا باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تھی جو حضرت جبریل کے دل میں بھری ہوئی تھی۔ وہ اللہ کے ہر رسول کے دوست اور اس کے اور اللہ کے درمیان واسطہ رہے ہیں۔ آپ ان کے آخری محبوب تھے۔ اللہ کے نزدیک آپ کی جو قدر و منزلت تھی، اس سے وہ خوب واقف تھے۔ بے حد محبت ہونے کے باوجود چالیس سال تک حضرت جبریل کو آپ سے ملنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ آج رات پہلی بار بہ حکم حق وہ اپنے حبیب سے آکر ملے۔ حالاں کہ آپ ان سے بالکل واقف نہ تھے، اس لیے محبت دو طرفہ نہ تھی۔ جان پہچان اور باہمی دوستی رکھنے والے بچھڑے ہوئے دو شخص ملتے ہیں۔ باہم بغل گیر ہوتے اور ایک دوسرے کو بھینچتے ہیں۔ اس بھینچ بھانچ سے دونوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص غائبانہ کسی سے بے حد محبت رکھتا ہو اور محبوب شخص نہ اسے پہچانتا ہو، نہ اس کی محبت کو جانتا ہو پھر اتفاقیہ دونوں کی ملاقات ہو جائے اور محبت کرنے والا بہ تقاضاے محبت بغل گیر ہو کر گرم جوشی کے ساتھ محبوب شخص کو بھینچے تو نہ پہچاننے کی وجہ سے اسے اس کے بھینچنے سے بڑی وحشت و تکلیف ہو گی۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت حضرت جبریل کے بھینچنے سے تکلیف و مشقت ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ اللہ کا مقرب و معظم اور میرا دوست فرشتہ روح القدس ہے تو آپ بھی بہ تقضاے محبت انھیں بھینچتے۔ اور کیا عجب ہے کہ آپ کی زبان سے بھولا بھالا عذر ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ سن کر حضرت جبریل کو آپ پر اور بھی پیار آیا ہو کہ جسے اللہ علم الاولین و الاٰخرین دینے والا اور اگلے پچھلے تمام علما کا امام بنانے والا ہے، وہ کس سادگی سے ’ما انا بقارئ‘ کہہ دیتا ہے۔ صبر سے پوری بات کیوں نہیں سنتا۔

اور تحقیقی بات یہ ہے کہ موثر محل تاثیر میں تاثر کی صلاحیت کو سرگرم کار کرنے کے لیے مناسب تصرفات کیا کرتا ہے۔ ان تصرفات کے بغیر محل تاثیر میں تاثر کی صلاحیت ہویدا نہیں ہوتی۔ کسان بیج بونے کے لیے زمین میں مناسب تصرف اور اس کی چیر پھاڑ کرتا ہے۔ سنار زیور

بنانے کے لیے سونے چاندی میں مناسب تصرف کرتا ہے۔ گلا تاڈھالتا اور کوٹا پیٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جو علوم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ پاک میں بہ تدریج ڈالنے منظور تھے، اُن کے اخذ و تلقی اور فہم و ادراک کی جو صلاحیت آپ کے اندر رکھی تھی، اسے سرگرمِ کار کرنے کے لیے جبریل کو آپ کے بھینچنے پر مامور فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ موثر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محل تاثیر تھے اور حضرت جبریل آلۂ تاثیر حق تھے۔

القصہ حضرت جبریل اپنا اور اس کلام کا کچھ تعارف کرائے بغیر آپ کو یہ کلام تلقین کر کے آپ کی نظر سے غائب ہو گئے۔ اب فرطِ دہشت سے آپ غار میں نہ رک سکے، حالاں کہ آپ اعتکاف سے فارغ ہو کر دن میں گھر واپس ہوا کرتے تھے، مگر اب رات کی تاریکی میں ہی واپس ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: 'فوجع بها رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجف فؤاده و ترجف بوادره فدخل على خديجة بنت خويلد فقال: ''زملوني'' فزملوه حتى ذهب عنه الروع فقال: ''يا خديجة، ما لي''؟ و اخبرها وقال: الخبر لقد خشيت على نفسي'۔ حال یہ تھا کہ دل دھڑک رہا ہے۔ جسم اطہر پر کپکپی طاری اور زبانِ مبارک پر وہ مقدس کلام جاری ہے۔ اُس کلام کے کلمات سے یہ تو آپ قطعی طور پر جان چکے تھے کہ یہ میرے رب اللہ کی طرف سے ہے اور ان کلمات کے پردے میں میرے لیے عظیم الشان بشارت چھپی ہوئی ہے۔ دہشت کے ساتھ اس مسرت نے مل کر آپ کے اندر غیر معمولی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ خلافِ معمول گھر پہنچے۔ آپ کے لرزاں و پریدہ رنگ دیکھ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا گھبرا گئیں۔ پوچھا: کیسی طبیعت ہے؟ فرمایا: مجھے کپڑا اوڑھا دو، کپڑا اوڑھا دو، کپڑا اوڑھا کے وہ آپ کے پاس بیٹھیں۔ بارے لرزہ موقوف ہوا اور طبیعت سنبھلی تب آپ نے ماجرا سنایا اور فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا خوف ہو گیا تھا کہ وہ شخص مجھے بھینچ بھینچ کر مار ہی ڈالے گا۔

(تشریح) واضح رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'لقد اَخْشی' بہ صیغۂ مضارع نہیں، بلکہ 'خَشِیْت' صیغۂ ماضی فرمایا تھا۔ شارحین نے غلط فہمی سے 'خَشِیْتُ' کو 'اَخْشٰی' کے معنی میں سمجھ لیا اور دور از کار توجیہات کر ڈالیں۔ اس کے بعد قصہ پڑھیے:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نہایت عقل مند و فرزانہ تھیں، بڑی خوبی و عمدگی سے آپ کو تسلی دی۔ راوی کے لفظوں میں: 'فقالت خديجة. كلا اَبْشِر. واللّٰهِ لا يخزيك الله ابدًا. انك

لَتصل الرحم و تحمل الکَلَّ و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق و تصدق الحدیث و تؤدی الامانۃ‘۔

حضرت خدیجہ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ نہ ایسا ہو سکتا تھا نہ آیندہ ہو گا کہ اللہ آپ کو رسوا فرمائے۔ آپ اللہ کے دوست اور پسندیدہ بندے ہیں۔ دوست کو اپنے دوست کی رسوائی گوارا نہیں ہوتی۔ انسان بھی اپنے دوست کی عزت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اور لوگ بھی اس کی عزت کریں اور تا امکان اسے ذلت و رسوائی سے بچانے کی کوششیں کرتا ہے۔ قدرت ہونے کے باوجود کسی کو ذلت و رسوائی سے نہ بچانا اس کی محبت نہ ہونے کی دلیل اور دوستی کے منافی ہے۔ اور آپ اس لیے اللہ کے حبیب ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کا بارِ معاش اٹھاتے ہیں۔ تقدیری حوادث کے شکار لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمان نوازی، راست گفتاری اور ادائے امانت آپ کا شیوہ ہے۔

(تشریح) یہ بڑی زبردست و قطعی برہان ہے جو حضرت خدیجہ نے اپنے عزت مآب شوہر صلی اللہ علیہ وسلم کے حبیب اللہ ہونے پر قائم کی تھی، اس لیے کہ ان اوصاف کا حاصل یہ ہے کہ آپ خلق خدا کے بڑے خیر خواہ و مددگار و فریادرس ہیں اور جو بندہ ایسا ہو، وہ یقیناً اللہ کا محبوب ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھو کہ جس شخص کے متعلق تمھیں معلوم ہو کہ وہ تمھاری اولاد کا سچا خیر خواہ و محسن ہے تو تمھارے دل میں اس کی عزت و محبت ضرور پیدا ہو جائے گی اور یہی کہو گے کہ وہ ایک شریف و کریم انسان ہے اور جس شخص کے متعلق تمھیں معلوم ہو کہ بلا وجہ تمھاری اولاد کے درپے آزار رہتا ہے اور اس سے بغض و دشمنی رکھتا ہے تو تمھیں اس سے نفرت ہو گی اور یہی کہو گے کہ وہ رذیل و کمینہ شخص ہے۔ اسی طرح یہ بھی قطعی ہے کہ جو شخص واقعی تمھارا دوست ہو گا تمھاری اولاد اور دیگر متعلقین سے بھی درجہ بہ درجہ محبت کا برتاؤ کرے گا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص فی الواقع تم سے سچی محبت رکھتا ہو اور تمھارے اہل و عیال سے بغض و عداوت رکھے۔ سچ کہا ہے شاعر نے:

و من بیّنات الحب اَن کان اھلُھا

احبَّ الی قلبی و عینَیَّ من اھلی

”محبت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ محبوب کے گھر والے بھی مجھے اپنے دل اور آنکھوں میں اپنے

گھر والوں سے زیادہ محبوب ہیں۔‘‘

اور ظاہر ہے کہ والدین کو اپنی اولاد سے جو محبت و شفقت ہوتی ہے، وہ اس رحمت و محبت کی پاسنگ بھی نہیں ہے جو اللہ ارحم الراحمین کو اپنے بندوں سے ہے۔ والدین اپنی اولاد کی کفالت کرتے ہیں جو نہ کلی ہے نہ حقیقی، بلکہ جزوی اور مجازی ہے۔ لیکن اللہ اپنے تمام بندوں کی کلی و حقیقی کفالت فرماتا ہے۔ اس لیے جو بندہ خلق خدا کا دوست و خیر خواہ اور مدد گار و فریادرس ہو گا، یقیناً وہ اللہ کا محبوب اور اس کی نظر میں قدر و عزت کا مستحق ہو گا۔ اور جس شخص کے دل میں واقعی اللہ کی محبت ہو گی، لازماً وہ اللہ کی مخلوق پر شفیق و مہربان اور ان کا غم خوار ہو گا۔

طویل مصاحبت، عقل سلیم اور بلند پایہ فرزانگی کی بہ دولت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یقین تھا کہ میرا گرامی مرتبہ شوہر غیر معمولی خوبیوں کا پیکر اور اللہ کا محبوب بندہ ہے اور ناممکن ہے کہ اپنے اس بندے پر اللہ کسی ایسے مرض یا آفت کو پڑ جانے دے جو رسوائی کا باعث ہو۔ اس لیے جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے، نہ وہ دماغی خلل اور کسی قسم کے جنون کا نتیجہ ہے نہ کسی آسیب کا اثر وہ تو کچھ اللہ کی طرف سے ہی کسی عظیم و اہم بات کا آغاز ہوا ہے۔ مگر وہ بات کیا ہے؟ اور وہ شخص کون تھا؟ اس سوال کا جواب نہ حضرت خدیجہ کے پاس تھا، نہ اس وقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ اور چونکہ حضرت خدیجہ کو اس کے من جانب اللہ ہونے کا یقین تھا، اس لیے وہ نہ آپ کو کسی طبیب یا کاہن کے پاس لے گئیں، نہ کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کے پاس نہ آپ کو مشورہ دیا کہ فلاں طبیب یا کاہن یا راقی (جھاڑ پھونک کرنے والے) کے پاس جایئے، بلکہ حقیقت کا کچھ سراغ پاسکنے کی توقع میں صبح کو وہ اپنے چچا کے بیٹے ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں:

فانطلقت به خديجة حتى اتت به ورقة بن نوفل بن اسد بن عبدالعزى ابن عم خديجة و كان امرءً ا تنصّر فى الجاهلية و كان يكتب الكتاب العربى فيكتب بالعربية من الانجيل ماشاء الله ان يكتب. و كان شيخاكبيرا قد عمِى. فقالت له خديجة: يا ابن عم! اسمع من ابن اخيك. فقال له ورقة يا ابن اخى، ما ذا ترى؟ فاخبره رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ خبره.

خود آپ اس مسئلہ میں اُن سے ملنے اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے، کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ جلد ہی اللہ کی طرف سے یہ مسئلہ حل ہو جانے والا ہے۔ لیکن حضرت خدیجہ کی دل دہی کی

خاطر آپ ان کے ساتھ ورقہ کے پاس تشریف لے گئے۔ ورقہ بن نوفل عنفوانِ شباب میں ملک شام چلے گئے تھے۔ وہاں تورات و انجیل کے علما سے مستفید ہوئے۔ لکھنا پڑھنا سیکھا اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ جوانی وہیں بیت گئی، بوڑھے ہو گئے تو اس قصد سے مکہ واپس آ گئے کہ گھر رہ کر انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کروں گا۔ لیکن بینائی جاتی رہی، اس لیے یہ کام نہ ہو سکا۔ اب سب سے الگ تھلگ اپنے گھر پڑے رہتے تھے۔ حضرت خدیجہ کے والد کا نام خویلد بن اسد تھا اور ورقہ کے والد کا نام نوفل بن اسد۔ حضرت خدیجہ یہ سوچ کر گئی تھیں کہ میرا بوڑھا نابینا بھائی ورقہ چونکہ عالم و فاضل اور صالح و عابد شخص ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس کے پاس اس گتھی کا حل ہو۔ جا کر کہا: بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا تو ماجرا سنیے! یہ ورقہ کو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ خدیجہ آپ کو ساتھ لے آئی ہیں۔ عمر کی بزرگی کا خیال کر کے حضرت خدیجہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محاورۃً ورقہ کا بھتیجا قرار دیا تھا۔ یوں بھی ورقہ و خدیجہ اوپر کے نسب میں آپ کے ساتھ قصی بن کلاب پر جمع ہو جاتے ہیں۔ علماے نسب کہتے ہیں کہ اوپر کے نسب کے لحاظ سے ورقہ بن نوفل اور عبد اللہ بن عبد المطلب بھائی بھائی قرار پاتے ہیں۔ ورقہ نے شفقت کے ساتھ پوچھا: بتاؤ بھتیجے، کیا ماجرا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماجرا بیان کیا۔ ورقہ نے توجہ سے پورا قصہ سن کر کہا: مژدہ باد یہ شخص جس نے اچانک آ کر آپ کو زور زور سے بھینچا اور یہ کلام تلقین کیا ہے، ناموس ہے۔ اللہ کا خاص سفیر جو اللہ کے نبیوں کو اللہ کا کلام و پیام پہنچانے پر مامور ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی وحی لے کر یہی ناموس بہ کثرت آیا ہے۔ آپ کے پاس اس کا آنا اور اس کلامِ حق کو لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے نبوت کا اعزاز آپ کو عطا فرمایا ہے۔ گو ابھی آپ سے ناموس نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو سخت احوال پیش آئیں گے۔ کاش، میں ان دنوں کچھ کر سکنے کے لائق رہوں۔ کاش، میں اس زمانہ میں زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ’فقال له ورقة: هذا الناموس الذی نزل الله علی موسی. یٰلیتنی فیها جَذَعًا یٰلیتنی اکون حیا اذ یُخرجك قومك‘۔

(تنبیہ) زہری سے یہ حدیث معمر بن راشد جزری و عقیل بن خالد ایلی و یونس بن یزید ایلی نے سن کر روایت کی تھی۔ تینوں کی روایت میں ’علی موسی‘ کے بعد ’یا لینتی فیها جذعا‘ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ’فیها‘ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ ماقبل میں کوئی لفظ ایسا مذکور نہیں ہے جو اس ضمیر کا

مرجع بن سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں زہری یا عروہ سے کچھ چھوٹ گیا ہے۔ اصل حدیث میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی تھی 'اِنَّ بین یدیك ایّامًا شدیدۃً' یا اس کا ہم معنی کوئی جملہ تھا۔ لفظ 'فِیھا' اس جملہ کے ہونے کا مقتضی ہے۔ میں نے اوپر اس کا مطلب واضح کر دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ کی یہ بات سن کر کہ آپ کی قوم ایک دن آپ کو یہاں سے نکال دے گی، تعجب ہوا، کیونکہ چھوٹے بڑے، امیر و غریب تمام اہل مکہ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی محفلوں میں الصادق الامین کے لقب سے آپ کا ذکر ہوتا تھا۔ تو وہ کیوں آپ کے دشمن بن جائیں گے۔ اس لیے از راہِ تعجب فرمایا: ''مجھے وہ نکال دینے والے ہیں؟'' چنانچہ حدیث میں ہے: 'فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم او مخرجیَّ ھم؟ قال: نعم، لم یأت رجل قط بمثل ما جئت بہ الا عودِی و اُوذی. و اِن یدرکنی یومك انصرْك نصرا مؤزرا. ثم لم ینشب ورقۃ اَن توفی و فتر الوحی' (صحیحین)۔

ورقہ نے جواب دیا کہ ہاں، یہ تو ہو کر رہنے والا واقعہ ہے، کیونکہ جو بھی اللہ کا رسول ہوا ہے اور جس نے بھی بہ حکم حق لوگوں کے سامنے حکم حق پیش کیا ہے، اُس سے دشمنی کی گئی اور اُسے تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ اور اگر وہ آنے والا وقت میری زندگی میں آ گیا تو میں مقدور بھر آپ کی بھرپور مدد کروں گا، لیکن ورقہ کا چند روز بعد ہی انتقال ہو گیا اور کچھ مدت وحی بند رہی۔ نہ آپ نے وہ فرشتہ دیکھا، نہ مزید کوئی آیت نازل ہوئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہیں تک بیان کیا تھا۔ آگے کا قصہ جس میں تقریباً ایک ماہ بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہونے اور پھر تسلسل کے ساتھ وحی آتے رہنے کا ذکر ہے۔ حضرت جابر نے بیان کیا ہے جو اُسی وقت حاضر مجلس ہوئے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک ذکر فرما چکے تھے۔ حضرت جابر کی حدیث ضروری وضاحت کے ساتھ بحمد اللہ مقدمہ تفسیر سورۂ مدثر میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب تین باتیں اور عرض کرتا ہوں۔

اول یہ کہ عامر بن شراحیل شعبی نے نہ معلوم کس سے سن کر کہہ دیا تھا کہ 'اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ' کے بعد تین سال تک وحی بند رہی۔ شعبی کی یہ بات قطعاً غلط اور محض ہوائی ہے جسے بعض مفسرین نے اس طرح نقل کر دیا ہے جیسے یہ کوئی صحیح و ثابت بات ہو۔ حضرت جابر کی حدیث صحیح جس کی بخاری و مسلم و احمد نے تخریج کی ہے، بتاتی ہے کہ وحی رکنے کی مدت چند روزہ تھی۔ بس تقریباً

ایک ماہ کا ذکر امام احمد کی تخریج کردہ حدیث جابر میں ہے۔ (مسند احمد 3/306)

دوم یہ کہ ورقہ نے نہ آپ کو جبریل نام بتایا تھا، نہ یہ کہ جو آپ کو کلام تلقین کیا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ بس 'ھذا الناموس الذی نزّل اللہ علی موسیٰ' کہا تھا۔ ناموس راز داں اور سفیر خیر کو کہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ کی اس بات پر تو اظہارِ تعجب کیا تھا کہ آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی، لیکن آپ نے ورقہ سے نہ ناموس کا مطلب پوچھا تھا نہ موسیٰ کے متعلق دریافت کیا کہ کون تھے، اس لیے کہ آپ کو یقین تھا کہ چونکہ یہ امر اللہ کی طرف سے ہے، لہٰذا تمام حقائق آیندہ خود ہی کھول دیے جائیں گے، کیونکہ جو آیات آپ کو تلقین کی گئی تھیں، وہ آپ کے لیے عظیم الشان بشارت اپنے اندر رکھتی تھیں۔ اس لیے نہ آپ کو اس سلسلہ میں ورقہ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت تھی، نہ آپ ورقہ کے پاس کچھ پوچھنے کے لیے گئے تھے۔ نہ اس سے پہلے آپ کبھی ورقہ سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے تھے، نہ اس کے بعد آپ کا ورقہ سے ملنا ہوا۔ اور اس وقت تو آپ محض حضرت خدیجہ کا دل رکھنے کے لیے ورقہ کے یہاں آ گئے تھے۔

رہا یہ کہ ورقہ نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ آپ نے وہی ناموس دیکھا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ورقہ ذی علم ہونے کی وجہ سے اس سے واقف تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بشارت دے گئے ہیں کہ میرے بعد احمد نام کا ایک رسول تشریف لائے گا۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہے: ''خداوند سینا سے آیا ساعیر سے چمکا اور فاران سے جلوہ گر ہوا'' یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل اور داؤد و سلیمان علیہم السلام کی پیشین گوئیاں بھی ان کے علم میں ہوں گی اور قرابتِ قریبہ کی وجہ سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے بھی واقف تھے، اس لیے انھوں نے سمجھ لیا کہ ان سابق انبیاے کرام کی بشارتوں کے مصداق آپ ہی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورقہ کے پاس آنا جانا نہ تھا۔ آپ کا مکہ میں میل جول صرف حضرت ابو بکر بن ابی قحافہ سے تھا اور جب سے آپ خلوت گزیں ہوئے تھے، ان سے بھی شاید ہی کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ ورقہ سے آپ کی یہ مختصر سی ملاقات جب حضرت خدیجہ آپ کو لے کر گئی تھیں پہلی بھی تھی اور آخری بھی، کیونکہ آپ ایک دو دن بعد پھر غارِ حرا میں جا کر معتکف ہو گئے اور غالباً اسی دوران میں ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ ورقہ نے سوچا ہو گا کہ آیندہ ملاقات

میں مفصل بات چیت کروں گا، لیکن پھر انھیں موقع نہ مل سکا۔ پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نبی ہو جانے کا علم ورقہ کی بات سن کر نہیں ہوا تھا، بلکہ جب آپ کو فرشتے نے غارِ حرا میں سورۂ علق کی ابتدائی آیات تلقین کی تھیں تو ان آیات کے مضمون سے اپنے نبی ہونے کا اجمالی علم حاصل ہو چکا تھا اور تفصیلی علم سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے وقت ہوا تھا۔ ورقہ نے اپنی گفتگو سے آپ کے اجمال علم و وجدان کی تصدیق کر دی تھی۔

تیسری بات یہ ہے کہ ورقہ نے 'ھذا الناموس الذی نزّل اللّٰہ علی موسیٰ' کہا تھا۔ نہ موسیٰ کے بجاے عیسیٰ کہا، نہ موسیٰ کے ساتھ عیسیٰ کہا، حالاں کہ ورقہ عیسائی تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُن رسولوں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کی تجدید کے لیے ہی بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے۔ وہ مستقل صاحب شرع رسول نہ تھے، بلکہ شریعت میں حضرت موسیٰ کے تابع تھے۔ اس سے سراغ لگتا ہے کہ ورقہ مومن و صالح العقیدہ شخص تھے۔ ان عیسائیوں میں سے نہ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق افراط و غلو میں مبتلا ہیں۔

پہلی وحی سورۂ فاتحہ تھی: بحمد اللہ آغازِ وحی کے متعلق حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کی ضروری شرح و وضاحت ناظرین کے سامنے آ گئی ہے۔ اس کے متعلق میں نے خامہ فرسائی اس لیے ضروری سمجھی کہ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ بخاری و مسلم، دونوں نے اس کی تخریج کی ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث چھ جگہ مذکور ہے۔ اس کی رو سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سورۂ علق کی یہ ابتدائی آیات ہی سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، لیکن حق یہ ہے کہ ابن شہاب زہری سے اس حدیث کو بیان کرنے میں متعدد غلطیاں ہو گئی تھیں۔ اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ مصحف شریف میں قرآنِ مجید کی جو پہلی لکھی ہوئی حدیث اور صحابۂ کرام سے آج تک تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خاتمۃ الکتاب اور ام القرآن بتایا ہے اور وہ فی الواقع پورے قرآن مجید کی اساس ہے۔ تمام چھوٹی بڑی سورتیں اسی پر مبنی ہیں جسے پوری عمارت اساس، یعنی بنیاد پر مبنی ہوتی ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ اس کی حمد و ثنا کریں اور اعتراف کریں کہ وہ تنہا ان کا معبود و حاجت روا ہے، پھر اس سے درخواست کی کہ انھیں راہِ راست پر چلائے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد پورے قرآنِ کریم میں

اس راہِ راست صراطِ مستقیم کا بیان ہے۔ دوپہر کے سورج سے بڑھ کر وضاحت ہے۔ اب کوئی بتائے کہ کیا بنیاد مقدم ہوتی ہے یا عمارت؟ کیا ماں سے پہلے اس کی اولاد وجود میں آتی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قولاً فرما دیا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے؟ اس لیے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سورۂ فاتحہ ہی سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس حدیث میں: 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ' کے بجائے: 'اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ' کا ذکر کرنا ابن شہاب زہری کی غلط بیانی ہی معلوم ہوتی ہے۔

(مقدمہ تفسیر سورۂ علق "مفتاح القران"، جلد پنجم، زیر طبع)

ثاقب علی

خاموش خدا، خاموش کلام

[یہ مضمون میرے مطالعے، مشاہدے، اور مختلف علمی ذرائع (لیکچرز / کتب) سے حاصل کردہ خیالات پر مبنی ہے، جنھیں تحریری شکل دینے میں AI (ChatGPT) سے معاونت لی گئی ہے۔ مصنف]

اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کی نافرمانی اور بغاوت کرتے ہیں۔ کچھ اللہ کے فرماں بردار ہیں اور کچھ نافرمان۔ بہت سے لوگ کفر اور انکار کی روش پر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس دنیا میں خاموش ہیں، کیونکہ یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔

اسی لیے ایسا نہیں ہوتا کہ اگر ہم جھوٹ بولیں تو فوراً ہماری زبان پر چھالا پڑ جائے یا اگر ہاتھ سے کوئی گناہ کریں تو ہاتھ شل ہو جائے یا آنکھوں سے کچھ غلط دیکھیں تو بینائی سلب کر لی جائے۔

اگر غور کیا جائے تو اللہ کی یہ خاموشی ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ خاموش ہیں اور انتظار میں ہیں کہ شاید اُس کے بندے توبہ کر لیں۔ مزید یہ کہ اُنھوں نے ہمیں ہدایت کے لیے قرآن مجید عطا فرمایا ہے، جو اپنی ظاہری خاموشی کے باوجود ایک زندہ پیغام ہے۔

لیکن افسوس کہ ہم قرآن کو پڑھتے ہی نہیں یا اگر پڑھتے ہیں تو بغیر سمجھے پڑھتے ہیں۔ یہ ”خاموش“ کلام ہمیں ہمارے رب کی پسند و ناپسند سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ وہ کلام ہے جس کے ذریعے سے رب العٰلمین، کائنات کے مالک، ہم سے ہم کلام ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارا

خیر خواہ کون ہو سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ ہم قرآن کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ہم سو بہانے بناتے ہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں یا ہم قرآن پڑھ نہیں سکتے یا سمجھ نہیں سکتے۔

یاد رکھنا چاہیے:

اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جب اللہ تعالیٰ کی خاموشی ٹوٹ جائے۔

وہ دن، جس کے بارے میں قرآن بتاتا ہے کہ جب وہ نظروں کے سامنے آجائے گا تو ہر ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی، حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا دیں گی۔[1]

اسی دن اللہ کی طرف سے پکار آئے گی کہ اے مجرمو، آج تم سب الگ ہو جاؤ۔[2]

کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دن ہم ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جن کے بارے میں اللہ کے رسول شکایت کریں گے کہ اے میرے رب، میری اس قوم نے قرآن مجید کو نظر انداز کر دیا تھا۔[3]

اس دن کی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہمیں "خاموش خدا" کو دریافت کر لینا چاہیے، اُس کی اطاعت اختیار کرنی چاہیے، اُس کے کلام کو سمجھ کر پڑھنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے — کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جائیں جو آخرت میں خسارے میں ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کی تیاری کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

---

[1]۔ الحج 22:2۔

[2]۔ یٰس 36:59۔

[3]۔ الفرقان 25:30۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن

مطالعۂ سنن ابن ماجہ

(سنن ابن ماجہ کی احادیث سے متعلق استفسارات اور ان کا جواب)

(5)

مطیع سید: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ تمتع کے قائل تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے منع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کیوں منع کرتے ہیں، حالاں کہ حدیث میں اس کی اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ لوگ پیلو کے درخت کے نیچے جماع کریں اور پھر حج کو جائیں اور ان کے سر سے پانی ٹپک رہا ہو۔[1] کیا حکمران کے پاس یہ حق ہے کہ اپنے ذاتی ذوق کو اس طرح سختی سے لوگوں پر نافذ کرے، جب کہ دوسری طرف پیغمبر کی طرف سے اجازت بھی موجود ہو؟

عمار ناصر: اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ اس پابندی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ

---

[1] ۔ کتاب المناسک، باب التمتع بالعمرۃ الی الحج، رقم 2979۔

نہیں تھا کہ لوگ میرے ذاتی ذوق کے مطابق چلیں، بلکہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں پر صورت معاملہ کیا بن رہی ہے؟ تو انھوں نے دیکھا کہ یہ کوئی اچھی صورت نہیں ہے کہ عمرے کا احرام کھولنے کے بعد حج کے دنوں میں لوگ کسی درخت کے نیچے، کسی پہاڑ کی گھاٹی میں اور کسی چیز کی اوٹ میں بیویوں کے ساتھ مصروف ہوں، کیونکہ تمتع کرنے والے عمرے سے فارغ ہو کر اگر اپنی جسمانی ضروریات پوری کرنا چاہیں تو وہاں ان کے لیے رہایش اور چار دیواری وغیرہ کا تو کوئی خاص انتظام نہیں تھا تو ظاہر ہے، پھر وہ جہاں بھی موقع ملے گا، یہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو غالباً اس پہلو سے حضرت عمر کو مناسب معلوم ہوا کہ وہ مصلحت کے اصول پر ان دنوں میں عمرے پر پابندی لگا دیں تاکہ جو لوگ احرام باندھ کر آئیں، وہ پھر حج ادا کر کے ہی پابندیوں سے آزاد ہوں۔ تو اس واقعے سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ حکمران کو اپنا ذاتی یا ذوقی اجتہاد لوگوں پر نافذ کرنے کا حق حاصل ہے۔

دوسری بات یہ کہ خلفاے راشدین کو مسلمان اس طرح سے نہیں دیکھتے تھے کہ وہ ہمارے حکمران ہیں۔ بنیادی طور پر وہ مسلمانوں کے دینی پیشوا تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس بنیاد پر پابندی نہیں لگا رہے تھے کہ میں حکمران ہوں اور میں یہ پابندی عائد کر سکتا ہوں۔ جب وہ حکمران نہیں تھے تب بھی دینی معاملات میں اجتہاد کرتے تھے اور کئی معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اصرار کرتے تھے۔ انھی کے اصرار پر قرآن میں امہات المومنین کے لیے حجاب کا حکم نازل ہوا تھا۔

مطیع سید: حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو یہ کر سکے کہ مدینے میں مرے تو اسے چاہیے کہ وہ مدینے میں مرے، کیونکہ میں ان لوگوں کے لیے جو مدینے میں مریں گے، گواہی دوں گا۔[2] مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید مدینے کو آباد رکھنے کے لیے وہاں مسلمانوں کی ضرورت تھی، اس لیے آپ نے یہ فرمایا، ورنہ محض مدینے میں وفات ہونے میں ایسی کیا فضیلت ہو سکتی ہے؟

عمار ناصر: ہجرت کے بعد تو سب لوگ مدینے میں ہی آ رہے تھے، اس لیے یہ حدیث مدینے

---

[2]۔ کتاب المناسک، باب فضل المدینۃ، رقم 3112۔

کی طرف ہجرت کی ترغیب نہیں دے رہی۔ اصل میں آپ اس تناظر میں بات فرما رہے ہیں کہ آپ کے بعد بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد مدینے میں ہی مقیم رہے۔ آپ کو نظر آ رہا تھا کہ جیسے جیسے فتوحات ہوں گی اور نئے مراکز بنیں گے اور سہولیات اور تمدن کے اعتبار سے دوسرے علاقے زیادہ پرکشش بن جائیں گے تو مدینہ کہیں بالکل بے آباد نہ ہو جائے، کیونکہ مدینے میں اس وقت اس طرح کی سہولتیں اور تمدنی ترقی نہیں تھی اور وہاں کا موسم بھی گرم تھا اور کچھ وبائی صورت حال بھی تھی۔ اس تناظر میں آپ نے فرمایا کہ میرے بعد میرے شہر کو بالکل ویران نہ کر جانا۔ مدینے میں فوت ہونے کا مطلب یہی ہے کہ لوگ مدینے میں رہیں اور یہیں وفات پائیں۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس گنجایش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو ہماری مسجد میں نہ آئے۔[3] اس فرمان میں تو بڑی سختی ہے اور بہ ظاہر کوئی گنجایش نہیں دی جا رہی، لیکن احناف کے علاوہ دیگر ائمہ کے ہاں قربانی واجب نہیں، بلکہ سنت ہے۔ تو کیا دیگر ائمہ کے سامنے کچھ اور احادیث ہیں جن کی بنا پر وہ قربانی کو لازم اور واجب قرار نہیں دیتے، بلکہ سنت قرار دیتے ہیں؟

عمار ناصر: حدیث سے فقہی مسئلہ اخذ کرنے میں فقہا کا ایک عمومی اصول ہے، جس کو احناف بھی مانتے ہیں کہ کسی موضوع سے متعلق تمام احادیث کو دیکھ کر طے کرنا ہوتا ہے کہ فقہی طور پر کوئی حکم واجب ہے یا سنت ہے۔ اور اگر کسی ایک نص میں ایسا پہلو دکھائی دے رہا ہے جو نصوص کی مجموعی دلالت سے مختلف ہے تو اس نص کا صحیح محل طے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا اس کے سیاق کو سمجھا جاتا ہے کہ یہاں کس خاص پہلو سے یہ تاکید بیان کی جا رہی ہے۔ جیسے جمعے کے دن غسل کرنے کے معاملے میں بہت تاکید آئی ہے اور واجب تک کے الفاظ ہیں، لیکن مجموعی دلائل دیکھے جائیں تو یہ ان معنوں میں واجب نہیں ہے کہ اگر غسل نہیں کیا تو جمعہ ادا نہیں ہو گا یا آدمی گناہ گار ہو گا۔ اسی طرح قربانی سے متعلق اس حدیث میں بھی تاکید کا ایک اسلوب ہے، جب کہ دیگر احادیث میں یہ الفاظ آتے ہیں: 'من اراد منکم' کہ تم میں سے جو قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ تو دیگر احادیث کی روشنی میں اس کو سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر قربانی کرنے کی گنجایش ہو تو تاکید

---

[3]۔ کتاب الاضاحی، باب الاضاحی وواجبۃ ھی ام لا، رقم 3123۔

یہی ہے کہ قربانی کی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے بعض مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کی ترغیب دینے کے لیے ارشاد فرمایا کہ تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت گھر میں نہ رکھا جائے، اسی طرح یہ دیکھتے ہوئے کہ لوگ قربانی کر سکتے ہیں، لیکن اس سے گریز کا پہلو اختیار کر رہے ہیں، آپ نے یہ تاکید بیان فرمائی ہو۔ 'لستم' اگر ایک مستحب عمل سے گریز اختیار کیا جا رہا ہو تو اس کو بھی تاکید سے بیان کرنا ایک جائز اسلوب ہے۔ اس سے لازم یہ نہیں آتا کہ آپ اس سے اس عمل کے عمومی طور پر لازم اور واجب ہونے کا حکم اخذ کریں۔

مطیع سید: لیکن احناف اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ ایک بچی مجھے بتا رہی تھی کہ میں نے اپنے جہیز کے لیے سامان رکھا ہوا ہے، لیکن ایک مولانا صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس میں سے کچھ سامان بیچ کر ان پیسوں سے قربانی کروں۔

عمار ناصر: میرے لیے بھی تعجب کی بات ہے کہ احناف کا جو عمومی منہج ہے، یہ رائے اس سے ذرا ہٹ کر ہے۔ خاص طور پر احناف کہتے ہیں کہ جو عموم بلویٰ کی نوعیت کا معاملہ ہو، یعنی جو مسئلہ ہر ایک کو پیش آنے والا ہو، اس میں ہم خبر واحد سے وجوب کو ثابت نہیں کر سکتے۔ تو یہ غور طلب سوال ہے کہ وہ کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور عراق میں کیا صورت حال تھی جس کی وجہ سے امام صاحب کا رجحان اس طرف گیا کہ قربانی نہ صرف واجب ہے، بلکہ اس کو ہر فرد پر واجب قرار دیا۔ پھر قربانی کی گنجایش کے سوال کو بھی حنفی فقہا نے زکوٰۃ کے نصاب سے جوڑ دیا، جس سے عام مسلمان کے لیے مزید مشکل پیدا ہو گئی۔

مطیع سید: حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قربانی کی بکریاں دیں اور انھوں نے اپنے ساتھیوں کو بانٹ دیں۔ ایک سال سے کم عمر کا ایک بکری کا بچہ رہ گیا۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کی قربانی کر لو اور تمھارے بعد یہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔[4]

عمار ناصر: اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ یہ تمھارے لیے کافی ہو جائے گا، لیکن تمھارے بعد کسی اور کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ ایک خاص

---

[4]۔ کتاب الاضاحی، باب ماتجزی من الاضاحی، رقم 3138۔

استثنائی اجازت دی گئی تھی، لیکن بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ اگر سال سے کم کا دنبہ ہے، لیکن اس کی صحت اور قد کاٹھ اچھا ہے تو وہ اس رخصت کی تعمیم کے قائل ہیں۔ بعض دیگر روایات سے بھی تعمیم کی گنجایش نکلتی ہے۔

مطیع سید: فقہا تو جانور کی صحت وغیرہ کی بات کرتے ہیں، لیکن اس حدیث میں صحابی کو دیکھا گیا ہے کہ ان کی صورت حال شاید ایسی تھی کہ انھیں اس کی اجازت دی گئی۔

عمار ناصر: جی، حدیث سے ظاہر اًتو یہی لگ رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر انھیں انفرادی اجازت دی۔ لیکن فقہی اجتہادات میں نصوص کی تاویل اور تعبیر میں بڑی گنجایش ہوتی ہے۔ اس میں اصل میں فقیہ کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مختلف نصوص سے سامنے آنے والے پہلوؤں اور شریعت کے عمومی اصولوں کے لحاظ سے کوئی فقہی اجتہاد معقول بن رہا ہے یا نہیں۔ کسی ایک خاص نص کا کسی اجتہاد پر سو فی صد منطبق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

مطیع سید: حضرت سعید بن خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک مینڈھا قربانی کے لیے خریدا، پھر بھیڑیا اس کے کان اور سرین کاٹ کر لے گیا۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی قربانی کر لو۔[5] لیکن بعض علما فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں نیا جانور لینا پڑے گا۔

عمار ناصر: فقہی آرا کو تو دیکھنا پڑے گا، لیکن شرعی اصول یہی ہے کہ آپ جب قربانی کے لیے جانور لے رہے ہیں تو عیب دار جانور نہیں لیں گے، کیونکہ اس وقت آپ کے اختیار میں ہے۔ البتہ جب آپ نے تندرست جانور لے لیا اور اس کے بعد کوئی آفت آ گئی، جیسا کہ اس حدیث میں بتایا گیا کہ بھیڑیا لے گیا یا چوٹ لگ گئی یا جانور گر کر زخمی ہو گیا تو پھر قربانی کرنے والے کی استطاعت کو دیکھنا ضروری ہے۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب یہ آدمی نئے جانور کا بندوبست نہیں کر سکتا اور جو عیب پیدا ہو گیا ہے، اس میں اس کا کوئی قصور شامل نہیں ہے تو آپ نے اس کو اجازت دے دی کہ وہی جانور قربان کر لے۔ میری رائے میں تو یہی شریعت کے عمومی مزاج کا تقاضا ہے۔ البتہ اگر آدمی مال دار ہے اور نیا جانور لے سکتا ہے تو پھر اس کو لینا چاہیے۔ اس

---

[5]۔ کتاب الاضاحی، باب من اشتری اضحیۃ صحیحۃ فاصابھا عندہ شیئ، رقم 3146۔

کو رخصت پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ فقہا بھی اگر مال دار آدمی کے متعلق یہ کہتے ہیں تو درست ہے، لیکن اگر غیر مستطیع کو بھی پابند کرتے ہیں تو وہ شریعت کے مزاج کے بھی خلاف ہے اور اس حدیث کے بھی منافی ہے۔

مطیع سید: احادیث کے رواۃ میں بعض دفعہ کسی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کذاب ہے، جیسے جابر جعفی کذاب ہے۔ یہ اس کی کسی خاص روایت کے حوالے سے کہا جارہا ہوتا ہے یا یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ عمومی طور پر کذاب اور جھوٹا ہے؟

عمار ناصر: جب راوی کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو وہ اس خاص حدیث کے حوالے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا عمومی کردار بیان کیا جارہا ہوتا ہے۔

مطیع سید: کیا متن سے بھی یہ چیز معلوم ہوتی ہے کہ اس کو آخر اس روایت میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہوگی؟

عمار ناصر: یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ محدثین اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ اگر متن سے بھی جھوٹ جھلک رہا ہے اور وہ راوی بھی جھوٹا ہے تو محدثین اس کا درجہ مختلف متعین کریں گے۔ لیکن اگر متن سے نہیں لگ رہا کہ اس میں وضع شامل ہے، لیکن سند میں کوئی راوی جھوٹا آگیا ہے تو پھر وہ دیکھیں گے کہ اگر اس کے دیگر تائیدی قرائن موجود ہیں تو وہ اس کو کسی نہ کسی درجے میں لے لیں گے، تائیداً واستشہاداً قبول کر لیں گے۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ذوالحجہ کا چاند نظر آجائے اور تم میں سے کسی کا قربانی کا ارادہ ہو تو اپنے بال اور بدن کے اجزا، یعنی ناخن وغیرہ نہ کاٹے۔[6] امام داؤد ظاہری اور محمد اسحٰق وغیرہ کے نزدیک تو یہ حرام ہے۔

عمار ناصر: ان حضرات نے اس کو ظاہر پر محمول کر لیا اور اس کو واجب قرار دیا ہے، لیکن جمہور فقہا اس کو استحباب پر ہی محمول کرتے ہیں۔

مطیع سید: فقہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو بعد میں دیکھ کر اندازہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے وہ بات فرما رہے تھے تو آپ

---

[6]۔ کتاب الاضاحی، باب من اراد ان یضحی فلا یاخذ فی العشر من شعرہ واظفارہ، رقم 3149۔

کی گفتگو کا انداز، لب ولہجہ اور اسلوب اس بات کو طے کر رہا ہوتا تھا کہ یہ حکم واجب ہے یا مستحب ہے یا ممانعت کس درجے کی ہے۔ اس لحاظ سے تو صحابہ کا حدیث کا فہم نہایت اہم ہو جاتا ہے۔ کیا ان کے فہم کو اس سلسلے میں پوری اہمیت دی جاتی ہے؟

عمار ناصر: بالکل دی جاتی ہے۔ اسی لیے اصول فقہ میں یہ بحث ہے کہ کسی حدیث کی تشریح میں فقہاے صحابہ، خصوصاً وہ صحابی جو اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں، ان کے فہم کا کتنا اعتبار ہے۔ میری کتاب ''فقہ الحدیث میں احناف کا اصولی منہج'' میں اس پر ایک تفصیلی فصل شامل ہے۔

مطیع سید: یہ چیز صرف احناف لیتے ہیں یا سارے فقہا لیتے ہیں؟

عمار ناصر: مطلقاً تو صحابی کے فہم یا تعبیر کو فقہا یا محدثین میں سے کوئی بھی حجت قرار نہیں دیتا۔ سب مکاتب فکر کچھ خاص پہلوؤں سے اس کو اہمیت دیتے ہیں، اور کچھ دوسرے پہلوؤں سے اختلاف کی گنجایش رکھتے ہیں۔ مثلاً حدیث کے براہ راست مفہوم سے آگے بڑھ کر اگر صحابی نے اس سے کوئی استنباط کیا ہے تو وہ ایک فقہی اور اجتہادی عمل ہے، اس میں آپ کسی صحابی کے اجتہاد سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن احناف بعض روایتوں میں ایسا بھی کرتے ہیں کہ حدیث کے راوی نے اس کا جو مطلب سمجھا، اس کو چھوڑ دیتے ہیں، جب کہ محدثین کہتے ہیں کہ اس راوی نے جو حدیث سنی ہے اور احوال و قرائن سے وہ اس کا جو مطلب سمجھ رہا ہے، وہی مراد ہونا چاہیے۔ حنفیہ کے ہاں کافی مثالوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ جب حدیث کا متبادر مفہوم ان کے فقہی سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتا تو وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے، صحابی سے بات سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ یہ تھوڑی سی عجیب بات لگتی ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہ تو ذہین لوگ ہیں، ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ حدیث کا مطلب نہیں سمجھے ہوں گے، یہ عجیب بات ہے۔

مطیع سید: حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑے کو نحر کیا اور گوشت بھی کھایا۔[7] کیا وجہ ہے کہ بہت سی روایتیں جن کی بنیاد پر احناف گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، محدثین کے ہاں وہ کم زور ہوتی ہیں۔ اکثر و بیش تر روایتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر محدثین نے جرح کی ہوتی ہے۔

---

[7]۔ کتاب الذبائح، باب لحوم الخیل، رقم 3190۔

عمار ناصر: یہ تو منہج کا فرق ہے۔ محدثین کا منہج یہی ہے کہ ہم نے تحقیق کر کے، جو حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور زیادہ مستند ہو، اس کو لینا ہے۔ احناف یہاں سے اپروچ نہیں کرتے، احناف کا منہج مختلف ہے۔ وہ دیگر چیزوں کو دیکھتے ہیں کہ حدیث، قرآن کے خلاف نہ ہو، اور جو معروف عمل ہے، اس کے خلاف نہ ہو، اکابر صحابہ کا جو فہم اور عمل نقل ہوا ہے، اس کے خلاف نہ ہو، کوئی مضبوط اور قوی قیاس ہے تو اس کے معارض نہ ہو۔ احناف ان چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس میں وہ کئی دفعہ ایسی روایات کو لے لیتے ہیں جو محدثین کے اصولوں کے مطابق کم زور ہوتی ہیں، لیکن احناف کے فریم ورک میں فٹ بیٹھتی ہیں۔ مثلاً غیر مسلم اور مسلمان کے قصاص اور دیت میں برابری ہے یا نہیں؟ سند کے لحاظ سے جو زیادہ صحیح اور مستند احادیث ہیں، وہ محدثین کی تائید میں ہیں اور جو نسبتاً کم زور حدیثیں ہیں، وہ احناف کی تائید میں ہیں، لیکن احناف کہتے ہیں کہ ہمارا جو اصولی منہج ہے، وہ ان احادیث کا موید ہے تو ہم انھی کو ترجیح دیں گے۔

مطیع سید: نتیجے کے طور پر احناف کا جو اصول ہے، وہ زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے؟

عمار ناصر: جی بالکل، احناف کا اصولی منہج آپ کو تعبیر کے دائرے میں کافی گنجایش دے دیتا ہے۔

مطیع سید: اس کا مطلب ہے کہ احناف کو روایت کی اسناد کے حوالے سے اتنی پریشانی نہیں ہے، جیسے محدثین کہتے ہیں کہ پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ حدیث سنداً کم زور ہے یا صحیح۔

عمار ناصر: جی، سند کی معیاریت احناف کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر اس کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ صحابہ کا تعامل کیا ہے یا مجموعی طور پر شریعت کا مزاج کیا ہے یا جو مشہور و معروف احادیث ہیں، ان سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ جو غریب احادیث ہوں، احناف کے منہج میں درجہ بندی میں ان کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔

مطیع سید: ایک لحاظ سے دیکھیں تو رواۃ کی جانچ پڑتال کے اعتبار سے محدثین کی جو بہت بڑی کاوش ہے، وہ بہت اہمیت کی حامل نہیں رہ جاتی۔

عمار ناصر: تاریخی پہلو سے تو اس کی بڑی اہمیت ہے۔ تاریخی پہلو سے دیکھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بہت سے اقوال منسوب ہو رہے تھے، ان میں قابل اعتبار اور قابل استناد اقوال کون سے ہیں؟ اس اعتبار سے تو محدثین کا کام آپ کو مدد دیتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ آپ نے

اس مواد میں کسی خاص حدیث کی تعبیر کیسے کرنی ہے اور دیگر دلائل سے اس کا تعلق کیا بنتا ہے تو وہ ایک الگ معاملہ ہے۔

مطیع سید: ٹڈی کے بارے میں ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ اسے بد دعا دی اور آپ نے فرمایا کہ یہ مچھلی کی چھینک سے پیدا ہوتی ہے۔[8] کیا یہ ضعیف حدیث ہے؟

عمار ناصر: یہ کوئی ایسی حدیث نہیں ہے کہ جس پر کلام کیا جائے، یہ کم زور روایت ہے۔

مطیع سید: آپ نے گرگٹ کو بھی مارنے کا حکم دیا ہے، کیا وجہ تھی؟[9]

عمار ناصر: حدیث میں 'وزغ' کا لفظ ہے، اب وہ چھپکلی ہو یا کوئی اور اسی طرح کا جانور ہو، اس کو مارنے کا اصول وہی ہے جو بیان ہوا ہے کہ جو جانور موذی ہے، نقصان پہنچا سکتا ہے یا گھروں میں ان کا ہونا معمولات میں خلل کا باعث بن سکتا ہے تو ان کو مار سکتے ہیں۔

مطیع سید: مردوں میں بہت کامل گزرے ہیں، لیکن عورتوں میں کوئی کاملہ نہیں گزری سوائے مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون کے۔[10] یہ کاملیت کیا چیز ہے؟ اس کا کیا معیار ہے؟

عمار ناصر: کاملیت سے مراد قرب الٰہی اور روحانیت اور ایمان اور تقویٰ میں خاص مقام کا حامل ہونا ہے۔ اس کا معیار تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

مطیع سید: کیا وجہ ہے کہ عورتوں میں کاملیت نہیں رہی، حالاں کہ ان میں بھی بہت نیک اللہ کی بندیاں ہیں اور ان کے بطن سے تو انبیا بھی پیدا ہوئے۔

عمار ناصر: میرا خیال ہے کہ اگر آپ کاملیت کا اس درجے کے ساتھ تقابل کریں جو نبوت اور رسالت کے ساتھ خاص ہے تو خواتین کو تو اس طرح نبوت کا منصب نہیں دیا گیا، اور یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو عورتوں میں بھی نبوت کو جاری کر دیتا، لیکن اللہ نے جاری نہیں کیا تو میرا خیال ہے یہ بات بھی اسی پہلو سے ہے۔

مطیع سید: میں نے کہیں پڑھا کہ ابن رشد یا ابن خلدون طب سے متعلق احادیث کا انکار کرتے

---

[8] ۔ کتاب الصید، باب صید الحیتان والجراد، رقم 3221۔

[9] ۔ کتاب الصید، باب قتل الوزغ، رقم 3228۔

[10] ۔ کتاب الاطعمہ، باب فضل الثرید علی الطعام، رقم 3280۔

ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر تو یہ باتیں بتانے کے لیے نہیں آتا۔ پیغمبر کا کام اخلاق اور عقائد کو درست کرنا ہے۔ اس ایک نکتے سے وہ ان احادیث کا انکار کر دیتے ہیں، حالاں کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں ''کتاب الطب'' کے عنوان سے بے شمار روایتیں بیان کی ہیں۔

عمار ناصر: نہیں، ابن خلدون وغیرہ ان احادیث کو رد نہیں کرتے اور یہ نہیں کہتے کہ یہ حدیثیں ہی صحیح نہیں ہیں، بلکہ ان احادیث کی نوعیت کیا ہے، اس پر بات کرتے ہیں۔ اور یہ بات ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ، دونوں کرتے ہیں کہ پیغمبر اپنے زمانے کی ثقافت اور کلچر سے کٹا ہوا نہیں ہوتا، وہ اپنے معاشرے کی عادات اور حالات سے الگ ہو کر صرف دین کی باتیں بیان نہیں کرتا۔ وہ اس معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور اپنے معاشرے کے جو عمومی انسانی تجربات ہوتے ہیں، ان کو بھی بیان کرتا ہے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر کے منصب کا حصہ نہیں ہوتا اور نہ اس کا تقاضا ہے، لیکن نبی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم کے جو معروف تجربات ہیں، ان سے اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ کر لے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ جو احادیث میں آیا ہے، بیش تر طبِ عرب ہے۔ یہ آپ کو وحی سے نہیں ملی، بلکہ بنیادی طور پر اہل عرب کے طبی تجربات کا بیان ہے۔ اسی طرح کی رائے شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی ہے۔

مطیع سید: حجامہ کے لیے دن خاص کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہفتہ اور اتوار کے دن حجامہ کرانے سے بچو۔[11]

عمار ناصر: میرا خیال ہے کہ اس میں بھی پیچھے کچھ تجربات ہی ہوں گے یا کوئی اور مصلحت کا پہلو ہو گا۔

مطیع سید: داغنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور اپنی امت کے لیے اس کو ناپسند کیا، لیکن جب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو آپ نے ان کے لیے طبیب بھیجا اور اس نے ان کا علاج داغنے سے کیا اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بھی داغا گیا۔[12]

عمار ناصر: یہ متعارض احادیث کی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں کہ کہیں آپ اس علاج کی

---

[11] ۔ کتاب الطب، باب فی ایّ الایام یحتجم، رقم 3487۔

[12] ۔ کتاب الطب، باب من اکتوی، رقم 3492۔

تعریف کر رہے ہیں اور کہیں اس سے منع بھی کر رہے ہیں۔ محدثین ان میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ جو منع ہے، وہ شرعی ممانعت نہیں ہے، بلکہ شفقت کے پہلو سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ طریقۂ علاج موثر تو ہے اور اس وقت بعض بیماریوں کے لیے اس کا شاید کوئی متبادل بھی نہیں تھا، لیکن اس میں چونکہ تکلیف کا پہلو ہے، ظاہر ہے کہ جلائے جانے سے تکلیف ہوتی ہے تو طبعی طور پر یہ آپ کو پسند نہیں تھا۔

[باقی]

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(22)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

مولانا امین احسن اصلاحی کی پہلی اسیری 28/ مئی 1950ء کو ختم ہوئی۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ہم راہ ملتان سنٹرل جیل سے رہا ہونے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے اور وارث روڈ لاہور پر جماعت اسلامی کے مقامی حلقے سے درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ ان کے بیٹے ابو سعید اصلاحی بتاتے ہیں کہ اس درس قرآن میں حاضرین کی خاصی تعداد ہوتی تھی۔

مولانا اس وقت نائب امیر جماعت اسلامی تھے۔ اور جماعت ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کی فکری تربیت میں مصروف ہوگئی، یہاں تک کہ 1951ء میں ایک اور سنگ میل سامنے آیا۔ یہ تھا 1951ء کے صوبائی انتخابات۔

صوبائی انتخابات: جماعت اسلامی اور مولانا اصلاحی کا موقف

یاد رہے کہ پاکستان کا پہلا آئین 1958ء میں تشکیل پایا۔ اور اس وقت ملک 1935ء کے

انگریزی قانون کے عارضی بندوبست کے تحت چل رہا تھا۔ مرکزی اسمبلی موجود تھی اور ملک کا آئین اسی نے بنانا تھا، لیکن صوبائی اسمبلیاں عارضی اور نام زدگی کی بنیاد پر چل رہی تھیں۔ بلوچستان کو ابھی صوبے کی حیثیت نہیں ملی تھی۔ سرحد (خیبر پختونخوا) میں تقسیم سے پہلے کانگرس کی حکومت تھی، جواب ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ حکومت نے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ یہ پاکستان میں ہونے والے کسی بھی سطح کے پہلے انتخابات تھے۔

مولانا اصلاحی کا اس موقع پر یہ موقف تھا کہ جماعت اسلامی کو عوام میں فکری اصلاح کا کام جاری رکھنا چاہیے اور انتخابی اکھاڑے میں کودنے سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی انتخابات میں شرکت کرنے کی راے رکھتے تھے۔ جماعت کی اکثریت ان کی راے کے موافق تھی۔ چنانچہ جماعت نے محدود پیمانے پر انتخابات میں حصہ لیا اور کسی بھی سیٹ پر کوئی کامیابی حاصل نہ کی۔

مولانا اصلاحی کا انتخابی معرکہ

اگرچہ مولانا اصلاحی انتخابات میں شرکت کے ہرگز قائل نہیں تھے، لیکن جماعت کے نظم کی پابندی کرتے ہوئے انھیں لاہور کے ایک حلقے سے الیکشن بھی لڑنا پڑا۔

مولانا اصلاحی نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا کے منع کرنے کے باوجود ایک تقریب رکھی گئی۔ مولانا نے اس پر جب ناراضی کا اظہار کیا تو انھیں بتایا گیا کہ آپ کا محض تعارف درکار ہے۔ آپ ووٹ مانگنے کے لیے تقریر نہیں کریں گے، بلکہ حلقے کے لوگوں کو نصیحت کرنے اسٹیج پر آئیں گے۔ چنانچہ وہ اس مجمع میں تشریف لے گئے۔

مولانا بتاتے ہیں کہ میں نے اس مجمعے میں جا کر کہا کہ اگر میں آپ سے ووٹ مانگنے آیا ہوں تو مجھ پر خدا اور اس کے رسول کی لعنت ہو۔ میں تو آپ کو محض یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر کسی عوامی نمایندے کو آپ نے منتخب کرنا ہو تو اس کے اندر کن کن اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور اس کے بعد میں نے مختصر طریقے سے انھیں بتا دیا اور سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس نمایندے کو خود سے کسی عہدے کا حریص نہیں ہونا چاہیے۔

یہ واحد تقریر تھی جو مولانا نے اپنے ووٹروں کے سامنے کی۔ ظاہر ہے کہ جب خود امیدوار

اپنے ووٹروں سے یہ کہے کہ وہ ان سے ووٹ مانگنے ہی نہیں آیا اور اس کا میدان سیاست نہیں، بلکہ وہ دین کا طالب علم ہے تو لوگ انھیں کیوں ووٹ دیتے۔ مولانا کو بہت کم ووٹ ملے اور ان کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی اور صرف انھی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا، بلکہ جماعت اسلامی کے کم و بیش تمام امیدوار بری طرح شکست کھا گئے۔

اس کی وجہ بہت واضح تھی۔ جماعت کے پاس سوائے نظری بیانیے کے اور کوئی عملی پروگرام نہ تھا، جب کہ ایک بالکل نوزائیدہ ملک اس وقت زندگی کے ہر شعبے میں شدید مسائل کا شکار تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری، خوراک اور صحت کے مسائل، انفراسٹرکچر کی تعمیر، تعلیم کا اسٹرکچر وغیرہ، اور اس پر مطلوب مالی اور افرادی وسائل کی شدید کمی۔ لیکن جماعت اسلامی کے پاس صرف ایک حل تھا، جو ایک نکتے پر مشتمل تھا: اسلامی نظام کا نفاذ۔ اور اس کی کوئی شکل سامنے موجود نہ تھی۔ چنانچہ لوگ حیران تھے کہ یہ ''غیر مرئی نظام'' عوام کے مسائل کیسے حل کر سکے گا۔ اس کا کوئی عملی نقشہ پاکستان ہی میں نہیں، دنیا میں بھی کہیں موجود نہیں تھا، اس لیے جماعت عوام کو ماضی کے دھندلکوں کے سوا کچھ مہیا نہ کر سکی۔ جماعت تو اصل میں موجودہ مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کے لیے قائم ہوئی تھی، اور جب یہ انتہائی بنیادی کام ہو جاتا تو اسے عوام کو اس کے عملی مسائل کا حل بتانا تھا، مگر جماعت خالی پیٹ مسلمانوں کو محض نظریات کا ''پلاؤ'' کھلانے کی مہم جوئی کر رہی تھی۔ اس کا یہ بیانیہ خوف ناک مسائل کی گونج میں لوگوں کے لیے ناقابلِ التفات تھا۔ یوں وہ عوام تک اپنی آواز پہنچانے میں بری طرح ناکام رہی۔ اس موقع پر مولانا اصلاحی کی رائے بہت صائب تھی کہ جماعت کو وہی کام کرنا چاہیے جس کے لیے وہ قائم ہوئی ہے اور وہ ہے: فکری اصلاح اور دین پر عمل کرنے کی دعوت۔ اس کے لیے انتخابات میں شرکت قطعی غیر ضروری ہے۔

قادیانی مسئلہ: جماعت اسلامی اور مولانا اصلاحی

1953ء میں قادیانی مسئلہ ایک منظم عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مسئلہ اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن جب وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے 1952ء میں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمایندے کی حیثیت سے اجلاس میں شرکت کی تو ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ بہ طور مسلمان اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمایندگی نہیں کر سکتے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ یہ سر ظفر اللہ ہی تھے جنھوں نے 1947ء میں فلسطین کے حق میں پاکستان کی نمایندگی کرتے ہوئے ایک زبردست تقریر کی تھی اور ان کی تقریر کو بانی پاکستان سمیت سب نے بہت سراہا تھا۔ یہ سر ظفر اللہ ہی تھے جو قیام پاکستان سے پہلے 1931ء تا 1932ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے اور یہ سر ظفر اللہ ہی تھے جنھوں نے مسلم لیگ کے کہنے پر 1940ء کی قرارداد لاہور کا ڈرافٹ تیار کیا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد مذہبی اور سیاسی تنگ نظری اتنی بڑھی کہ احمدی جماعت کو غیر مسلم قرار دینے اور سر ظفر اللہ خان کے احمدی ہونے کی وجہ سے انھیں وزارت سے ہٹانے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ اسی سلسلے میں فروری 1953ء میں لاہور میں ایک جلوس نکالا گیا۔

یہ جلوس حکومتی اجازت کے بغیر نکالا جا رہا تھا، اس لیے گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی نے اسے روکنے کا حکم دیا۔ جلوس نہ رکا تو جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرائی گئی اور اس پر فائرنگ کر دی گئی۔ کئی افراد موقع ہی پر دم توڑ گئے اور متعدد زخمی ہو گئے۔ یاد رہے کہ اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ تھے۔ مرکز میں لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم اور غلام محمد گورنر جنرل تھے۔

یہ واقعہ عوامی غصے کو غیر معمولی حد تک بھڑکانے کا ذریعہ بنا۔ پہلے ہی سے مذہبی جماعتوں کی متفقہ تنظیم ”مجلسِ عمل تحفظِ ختم نبوت“ کے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کیے جا چکے تھے، لیکن ان کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ جیسے ہی یہ فائرنگ اور شہادتیں ہوئیں، پورے لاہور میں ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ حالات قابو سے باہر نکل گئے، جس کے نتیجے میں لاہور میں مارچ 1953ء میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس موقع پر تحریک ختمِ نبوت کی طرف سے یہ تین مطالبات پیش کیے گئے:

1۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

2۔ سر ظفر اللہ خان کو وزارتِ خارجہ سے برطرف کیا جائے۔

3۔ احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔

تحریک کے روحِ رواں علماے کرام، مشائخ، طلبہ اور عوام تھے، مگر اس تحریک میں جماعت اسلامی کا کردار ایک الگ نوعیت کا تھا؛ علمی، نظری اور قانونی۔ وہ نہ تو مظاہروں میں شریک ہوئی

اور نہ ہی امن و امان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کیا۔ اس موقع پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ''قادیانی مسئلہ'' کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا، جو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو کر خاص و عام میں مقبول ہو گیا۔ اس میں احمدیوں کے عقائد، عقیدۂ ختم نبوت اور ریاست کی آئینی ذمہ داریوں کو انتہائی سنجیدہ علمی انداز میں بیان کیا گیا۔ ان کے تمام دلائل کا نتیجۂ فکر اس ایک جملے میں دیکھا جا سکتا ہے:

''ریاست اگر اسلامی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ختمِ نبوت کے منکر کو مسلم کہلانے کی اجازت نہ دے۔'' (قادیانی مسئلہ 23)

یہ تحریر حکومت کی نظر میں ایک ''اشتعال انگیز'' اور ''فتنہ انگیز'' دستاویز بن گئی۔ حکومت کا موقف تھا کہ اس نے خاص و عام کو حکومت کے خلاف ایک طاقت ور بیانیہ فراہم کیا ہے، کیونکہ اس میں پہلی دفعہ علمی طریقے سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دلائل فراہم کیے گئے تھے۔

مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد ہزاروں افراد گرفتار کیے گئے۔ جماعت اسلامی، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس طرح کے ہنگاموں میں شریک نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سمیت جماعت اسلامی کے پچپن یا چھپن لیڈروں کو 29/ مارچ 1953ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا مودودی پر چونکہ ''اسٹیٹ'' کے خلاف بغاوت کا الزام تھا، اس لیے ان کے خلاف مقدمہ ایک فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔

پھانسی کی سزا اور مولانا امین احسن اصلاحی

11/ مئی 1953ء کو فوجی عدالت نے مولانا مودودی کو ''ریاست کے خلاف بغاوت'' کا جرم ثابت ہونے پر سزائے موت سنا دی۔ اس فیصلے نے ملک بھر میں ہلچل مچا دی۔ عوام، دینی جماعتیں، صحافی، بین الاقوامی انسانی حقوق کے ادارے اور متعدد اسلامی ممالک میں اس فیصلے کے خلاف شدید ردِ عمل سامنے آیا۔ یہ سزا ایک خالص علمی رائے کے خلاف دی گئی تھی۔ اس سے اختلاف سو فی صد ممکن تھا، لیکن اس پر کسی بھی قسم کی قانونی کارروائی کا کوئی جواز نہ تھا، جب کہ حکومت نے اسے غداری کے مترادف قرار دیا۔ بلاشبہ، یہ ریاستی جبر کی بدترین مثال تھی۔

اس واقعے پر میاں طفیل محمد نے ''جیل سے پھانسی کی سزا تک'' کے نام سے بہت خوب صورت

تحریر لکھی۔ یہ تحریر روزنامہ ''نوائے وقت'' سمیت متعدد جرائد ورسائل میں مارشل لاء اٹھنے کے بعد شائع ہوئی۔ ہم اس کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جب جیل میں مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور دیگر دو ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے اور ان کو پھانسی کی سزا دینے کی اطلاع دی گئی:

''شہر لاہور میں، مارچ 1953ء میں ہم لوگوں کو گرفتار کر کے لاہور سینٹرل جیل میں لے جایا گیا۔ ہم لوگ دیوانی گھر وارڈ کے صحن میں مولانا مودودی صاحب کی اقتدا میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے کہ دیوانی گھر وارڈ کا باہر کا دروازہ کھٹ سے کھلا اور چودہ پندرہ فوجی اور جیل افسر اور وارڈر احاطے میں داخل ہوئے۔ اور جہاں ہم نماز پڑھ رہے تھے وہاں قریب آکر کھڑے ہو گئے۔

ہم نے باقی نماز مکمل کرلی تو ان میں سے بڑے فوجی افسر نے جو مارشل لاء کورٹ کا صدر تھا، آگے بڑھا اور بولا:

تم میں مولانا مودودی کون ہیں؟

مولانا نے عرض کیا: میں ابوالاعلیٰ مودودی ہوں۔

''آپ کو ''قادیانی مسئلہ'' کتاب تصنیف کرنے پر موت کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ہے۔ البتہ آپ گورنر جنرل سے رحم کی اپیل کر سکتے ہیں''۔

مولانا نے بلا توقف کہا: ''مجھے کسی سے کوئی رحم کی اپیل نہیں کرنی ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں پر میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔''

اس کے بعد اسی افسر نے کہا: ''آپ نے مارشل لاء کے بارے میں روزنامہ ''تسنیم'' میں جو بیان دیا ہے اس پر آپ کو سات سال قید بامشقت کی سزا دی جاتی ہے۔''

... کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہیڈ وارڈن اور ان کے ساتھ کچھ دوسرے وارڈر آئے اور انھوں نے کہا: ''مولانا مودودی صاحب تیار ہو جائیں۔ وہ پھانسی گھر جائیں گے۔''

اس پر مولانا مودودی صاحب نے اطمینان سے اپنا کھلا پاجامہ، تنگ پاجامے سے بدلا، جو وہ گھر سے باہر جاتے وقت پہنا کرتے تھے۔ سر پر اپنی سیاہ قراقلی ٹوپی پہنی اور چپلی اتار کر سیاہ گرگابی

جوتا پہنا اور اپنا قرآن مجید لے کر اور ہم سب سے گلے مل کر نہایت اطمینان سے پھانسی گھر روانہ ہو گئے۔

اب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، مولانا مودودی صاحب کی قمیص، پاجامہ اور ٹوپی کبھی سینے سے لگاتے اور کبھی اپنے سر پر رکھتے، کبھی آنکھوں پر لگاتے اور بے تحاشا روتے ہوئے کہتے جاتے کہ: ”مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا مودودی صاحب بہت بڑے آدمی ہیں، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ خدا کے ہاں مودودی صاحب کا اتنا بڑا مرتبہ اور مقام ہے۔“

چودھری محمد اکبر صاحب بھی روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر صحن میں چلے گئے اور میں بھی روتا ہوا صحن میں ایک طرف نکل گیا اور ساری رات اسی طرح سے گزر گئی۔

اگلی صبح ایک وارڈر نے آ کر بتایا کہ ”مولانا مودودی صاحب تو عجیب آدمی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ اندازہ ہی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ پھانسی گھر گئے، وہاں کا لباس پہنا، جنگلے سے باہر پانی کے گھڑے سے وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھی اور ٹاٹ پر لیٹ کر تھوڑی دیر بعد خراٹے مارنے لگے۔ حالانکہ ان کے آس پاس پھانسی گھر کے دوسرے قیدی چیخ و پکار میں مصروف تھے۔“

مولانا مودودی صاحب کو پھانسی کی سزا کا اعلان ہوتے ہی ملک بھر میں ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر میں احتجاج شروع ہو گیا۔

انڈونیشیا کی اسلامی پارٹی کے وزیر اعظم ڈاکٹر ناصر صاحب نے حکومت پاکستان سے کہا کہ ”پاکستان کو مودودی صاحب کی ضرورت نہیں تو دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہے۔ پاکستان ان کو انڈونیشیا بھجوا دے“۔

سعودی عرب نے اس سزا کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ علیٰ ھذا القیاس بہت سے دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے بھی اور پاکستان میں تو ہر جگہ سے احتجاج ہوا۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے ہی روز حکومت پاکستان نے اعلان کر دیا کہ مولانا مودودی صاحب اور مولانا عبد الستار خاں نیازی صاحب کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب کو پھانسی گھر سے جیل کے بی کلاس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی یہ عمر قید عملاً 14 سال قید بامشقت کی تھی۔ اگرچہ یہ مارشل

لاء کورٹ کے تحت دی گئی تھی اور مارشل لاء ختم ہو جانے کے بعد اسے ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن مارشل لاء کے تحت سارے احکام اور سزاؤں کو انڈمنٹی ایکٹ کے تحت برقرار رکھا گیا تھا۔ اس لیے یہ سزائیں مارشل لاء اٹھ جانے کے باوجود بھی قائم اور جاری تھیں۔

جماعت اسلامی نے مولانا مودودی صاحب کی سزا کو کالعدم کرانے کے سلسلے میں لاہور ہائی کورٹ میں میاں منظور قادر ایڈووکیٹ کے ذریعے سے رٹ دائر کر دی اور ہائی کورٹ نے رٹ منظور کرتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو رہا کرنے کا حکم دے دیا، چنانچہ مولانا مودودی صاحب 28/ مئی 1955ء کو ڈسٹرکٹ جیل ملتان سے رہا ہو کر گھر آ گئے۔"

مولانا اصلاحی اس دفعہ ڈیڑھ برس تک قید رہے اور انھیں اگست 1954ء کو رہائی ملی۔ اس دوران میں انھوں نے اپنی تفسیر "تدبر قرآن" لکھنے کا ایک نقشہ بنایا اور اس کا ایک خاکہ مرتب کیا۔

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

اے کاش، کبھی سنتے معنی کی خبر لائی
الفاظ کے پیچوں سے انساں کی شناسائی

کیا رنگ دکھائے گی خرمن میں یہ چنگاری
ہر شخص ہے بستی میں خاموش تماشائی

اجڑے ہوئے خیموں کے خونابۂ مژگاں سے
آتی ہے تمدن کی تعمیر میں رعنائی

پھر شہرِ ملامت کے ہر کوچہ و منزل میں
مجروحِ تماشا ہے آشفتۂ تنہائی

میرے لیے کافی ہے ویرانۂ دل میرا
افلاک سے بڑھ کر ہے اس دشت کی پہنائی

شاہد محمود

خبرنامہ ”المورد امریکہ“

[جون 2025ء]

غامدی سینٹر میں 8 کتابوں کی تقریب رونمائی

مئی 2025ء میں غامدی سینٹر، ڈیلس امریکہ میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں کی تقریب رونمائی منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں کتابوں کے مصنفین میں سے سید منظور الحسن صاحب بہ ذات خود موجود تھے، جب کہ ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب اور جناب حمزہ علی عباسی نے آن لائن شرکت کی اور اپنے تاثرات بیان کیے۔ شائع ہونے والی کتابوں میں مدیر ”اشراق“ امریکہ منظور الحسن صاحب کی دو کتابیں ”حلال و حرام—جاوید احمد غامدی کا موقف“ اور ”غنا اور موسیقی—جاوید احمد غامدی کا موقف“، ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب کی کتاب ”خواتین کا پردہ—جاوید احمد غامدی کا موقف“، جب کہ جناب حمزہ علی عباسی کی کتاب ”میری دریافت: اللہ، اسلام اور آخرت کی جستجو میں“ شامل ہے۔ یہ ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مزید بر آں، جناب منظور الحسن کی اردو میں شائع شدہ چار کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے، جن کے نام یہ ہیں: ”Night Journey and Ascension“، ”The Descent of Jesus“، ”The Splitting of the Moon“ اور ”Thoughts of Ghamidi“۔ یہ کتابیں دنیا بھر

میں موجود ”المورد“ کے مراکز پر جلد دستیاب ہوں گی۔

”مذہب اور جدید دور کے چیلنجز“

گذشتہ ماہ غامدی صاحب نے مشہور موٹیویشنل اسپیکر اور پوڈ کاسٹر حافظ احمد صاحب کو ایک انٹرویو دیا، جس میں غامدی صاحب نے جدید دور میں مذہب کو پیش آنے والے چیلنجز کے حوالے سے گفتگو کی۔ مزید بر آں، غامدی صاحب نے حدیث، جہاد اور سود جیسے اہم موضوعات سے متعلق سوالات کے جواب بھی دیے۔ اس انٹرویو کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

”وائس آف ریسرچ“

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ”وائس آف ریسرچ“ کے نام سے ہونے والے سیمینارز کا سلسلہ جاری ہے، جہاں محققین اور اسکالرز اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ مئی 2025ء میں ”مسلم دنیا کا بحران اور حل“ اور ”انسانی دل کی اہمیت“ کے عنوانات سے دو سیمینارز منعقد ہوئے۔ پہلے موضوع پر ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی نے غزہ کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ان میں بہتری کے حوالے سے نہایت اہم امور کی طرف توجہ دلائی، جب کہ دوسرے موضوع پر ڈاکٹر سحر حفیظ نے گفتگو کی، جس میں انھوں نے انسانی دل کی اہمیت کو قرآن اور میڈیکل سائنس کی روشنی میں اجاگر کیا۔ مزید بر آں، اس سوال پر بھی گفتگو کی گئی کہ کیا قرآن اور میڈیکل سائنس الگ ہیں؟ یہ سیمینار آن لائن رابطے کی ایپ ”زوم“ پر ہوتا ہے، دل چسپی رکھنے والے حضرات ان سیمینارز میں براہ راست شرکت کر کے اپنے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

”اسلام اور ریاست —— اعتراضات کا جائزہ“

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ”اسلام اور ریاست“ کا موضوع زیر بحث ہے۔ گذشتہ ماہ اس موضوع پر منعقد ہونے والی نشستوں میں اسلام اور ریاست

کے حوالے سے غامدی صاحب کے نقطۂ نظر پر کیے جانے والے اعتراضات کو زیر بحث لایا گیا۔ مزید برآں، غامدی صاحب نے اقامت دین کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا اور مولانا مودودی کے تصور اقامت دین کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''تصنیف و تالیف میں مصنوعی ذہانت کا استعمال''

سید منظور الحسن صاحب نے اپنے اس مضمون میں تصنیف و تالیف میں چیٹ جی پی ٹی جیسے مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر کے استعمال کے حوالے سے چند اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ سافٹ ویئر ماہر مصنفین کے لیے معاون محقق و مدیر کے طور پر قابل قبول ہے، بشرطیکہ اس کا اعتراف کیا جائے۔ تاہم، نوآموز مصنفین کو اس سے گریز کی تلقین کی جاتی ہے تاکہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں نشوونما پا سکیں۔ مزید برآں، انھوں نے اِس موقف کی روشنی میں ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ'' کی مطبوعات کے لیے لائحۂ عمل بھی بیان کیا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے مئی 2025ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

مئی 2025ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ طٰہٰ کی آیات 86 تا 128 کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں ان احادیث کو زیر بحث لایا گیا جن میں ایمان و اسلام کے منافی چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

''زندگی سے حاصل ہونے والی گہری بصیرتیں''

گذشتہ ماہ حسن الیاس صاحب نے ''زندگی سے حاصل ہونے والی گہری بصیرتیں'' کے عنوان

سے ایک پوڈکاسٹ ریکارڈ کرایا، جس کے میزبان حافظ احمد صاحب تھے۔ اس میں حسن الیاس صاحب نے فکری، ذاتی اور معاشرتی نوعیت کے سوالات کے جوابات دیے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں بتایا کہ دین کی طرف رغبت حاصل کرنے میں سب سے اہم کردار مولانا طارق جمیل صاحب کی دعوت کا تھا۔ مزید برآں، انھوں نے مولانا طارق جمیل صاحب کے ساتھ اپنے دعوتی و فکری تعلق کی روداد بھی بیان کی۔ اس پوڈکاسٹ کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

Ask Ghamidi

یہ سوال وجواب کی آن لائن نشست ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے دینی اور اخلاقی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جوابات براہ راست غامدی صاحب سے حاصل کر سکیں۔ ہر ماہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس نشست میں حصہ لیتی ہے۔ مئی 2025ء میں اس نشست میں لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: ''خدا کی اصل کیا ہے؟''، ''کیا حجر اسود کو اللہ کا ہاتھ کہنا شرک ہے؟''، ''کیا انجیلِ برنباس مسلمانوں کی تصنیف ہے؟'' اور ''فیمنزم کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟'' ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''المورد'' آسٹریلیا کے ساتھ سوال وجواب کی نشست

گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن محمد حسن الیاس صاحب نے ''المورد'' آسٹریلیا کے احباب کے ساتھ سوال و جواب کی ایک نشست میں شرکت کی۔ اس نشست میں حاضرین کی جانب سے مختلف علمی و فکری نوعیت کے سوالات پوچھے گئے، جن کے حسن صاحب نے تسلی بخش جواب دیے۔ ان سوالات میں سے چند اہم سوال یہ ہیں: ''غیر مسلموں سے برتاؤ کا اسلامی تصور کیا ہے؟''، ''جمعے کے خطبات میں کون سی اصلاحات ضروری ہیں؟'' اور ''کیا نماز حدیث سے ملی ہے؟''۔ سوال و جواب کی اس نشست کی ریکارڈنگ غامدی

سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

''سنڈے اسکول'' میں اندراج

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام چلنے والے ''سنڈے اسکول'' کا مقصد طلبہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں بنیادی اسلامی اقدار کو پروان چڑھانا ہے۔ یہ اسکول گذشتہ نو سال سے سرگرم عمل ہے۔ اس اسکول کے فیکلٹی ممبران کالج اور یونیورسٹی کے وہ طلبہ ہیں جو غامدی سینٹر اور ''المورد'' کی دعوت سے متاثر ہیں اور اس کے کاموں میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسے جناب فرحان سید اور عاطف ساجد صاحب کی زیر نگرانی ''المورد'' امریکہ کی تعلیمی کمیٹی چلاتی ہے۔ سنڈے اسکول میں نئے طلبہ کے اندراج کا آغاز جولائی 2025ء میں ہو گا

''کیا ظلم جہاد کو لازم کر دیتا ہے؟''

حسن الیاس صاحب اپنے اس مضمون میں جہاد کی فرضیت کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ظلم اور زیادتی کا ظہور جہاد کی مشروعیت کا بنیادی سبب ہے، مطلوبہ قوت، وسائل اور اجتماعی قیادت کی دستیابی اس کے وجوب کے لیے لازم شرط ہے۔ لکھتے ہیں کہ قتال کا فیصلہ فرد یا گروہ کا نہیں، بلکہ اجتماعی قیادت اور ریاست کا اختیار ہے۔ علما کی طرف سے انفرادی فتوے کی بنیاد پر جہاد کا اعلان شرعی ضوابط کے خلاف اور امت میں فساد کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے مئی 2025ء کے شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

''اتمام حجت''

غامدی سینٹر نے جاوید احمد غامدی صاحب کی تمام ویڈیوز کو اے آئی کی مدد سے انگریزی زبان میں ڈب کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ انگریزی جاننے والے حضرات بھی غامدی صاحب کے افکار و نظریات سے مستفید ہو سکیں۔ مئی 2025ء میں 23 اعتراضات سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''اتمام حجت'' کو انگریزی زبان میں ڈب کر کے غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر

نشر کیا گیا ہے۔

''تفہیم الآثار'' سیریز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری ''تفہیم الآثار'' سیریز کے زیر عنوان مئی 2025ء میں منعقد ہونے والی نشستوں میں ''خوارج کے خلاف قتال''، ''بنی اسمٰعیل کی سلطنت''، ''قرآن کو اپنا رہنما بناؤ''، ''قرآن غلط پڑھنے پر بچوں کی تادیب'' اور ''رومی اور فارسی سلطنتوں کے خلاف اقدامات'' جیسے اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''سوال و جواب حسن الیاس کے ساتھ''

غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن حسن الیاس صاحب نے معروف یوٹیوب چینل ''مسلم ٹوڈے'' کے ساتھ ''Ask Hassan Ilyas'' کے نام سے ایک پروگرام کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ سوال و جواب پر مبنی پروگرام ہے، جس میں حسن الیاس صاحب حاضرین کی جانب سے پوچھے گئے علمی و فکری اور دینی سوالات کے جواب دیتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس پروگرام میں زیر بحث آنے والے چند اہم سوال یہ ہیں: ''کیا جنات کا فی الواقع کوئی وجود ہے؟''، ''حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کی بنیاد کیا ہے؟''، ''کیا حضرت نوح علیہ السلام کی 950 سال عمر سائنسی لحاظ سے ناقابل قبول ہے؟'' اور ''روایات کی بنیاد پر صحابہ پر طعن و تشنیع کرنے والوں کو کیسے سمجھایا جائے؟'' اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

غامدی سینٹر کی آن لائن خانقاہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام آن لائن خانقاہ کا سلسلہ جاری ہے۔ معز امجد صاحب ہر ہفتے اصلاحِ نفس کے پہلو سے اس کی ایک نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں لوگوں کے نفس کی اصلاح اور تربیت کے حوالے سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کی

طرف سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی منعقد ہونے والی نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم نکات یہ ہیں: ''لوگوں سے تعلق توڑنے کی حد''، ''معافی کا مفہوم کیا ہے؟''، ''خودی اور انا میں فرق'' اور ''خالق انسان سے کیا چاہتا ہے؟''۔ آن لائن خانقاہ کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب ''اسلام اسٹڈی سرکل'' کے عنوان سے ہر ماہ ایک سیشن کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس میں وہ مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے کے سیشن میں ''اگر ایک غیر متوقع واقعہ پیش آجائے''، ''طہارت'' اور ''آنکھ بدن کا چراغ ہے'' جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔ اور آخر میں حاضرین کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے جواب دیے گئے۔ یہ سیشن انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ اس سیشن کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

دوران قید میں اصلاحی صاحب کے معمولات

''حیات امین'' کی گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں مولانا امین احسن اصلاحی کی قید کے دوران میں علمی مصروفیات، روزمرہ معمولات اور صبر و استقامت پر مبنی طرزِ زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ نعیم بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ جیل میں انھوں نے دینی کتب کی تدریس اور تحریر و تحقیق جاری رکھی اور اہل خانہ کو تسلی بخش خطوط لکھے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو فکری پختگی، روحانی بلندی اور قربِ الٰہی کی عملی مثال ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے مئی 2025ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

”مبادی تدبر سنت“ اور ”مبادی تدبر حدیث“

شہزاد سلیم صاحب ”میزان لیکچرز سیریز“ کے تحت غامدی صاحب کی کتاب ”میزان“ کی انگریزی زبان میں تدریس کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ انھوں نے اس سیریز کے تحت ”مبادی تدبر سنت“ اور ” مبادی تدبر حدیث “ کے موضوع پر انگریزی زبان میں لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان لیکچرز کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“

گذشتہ ماہ دنیا نیوز پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام کے موضوعات یہ تھے: ”مذہبی اور سیاسی قیادت کی کشمکش“، ”قرآن اور سائنس“ اور ”تصوف کے بغیر تزکیۂ نفس کیسے ہو گا؟“۔ ان پروگراموں میں زیر بحث آنے والے سوالوں میں سے چند اہم سوالات یہ ہیں: ”دین پر عمل کرتے وقت سستی اور غفلت کو کیسے دور کیا جائے؟“، ”کیا قرآن اور سائنس کی بنائے استدلال ایک ہی ہے؟“، ”مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد کی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟“ اور ”مذہبی اور سیاسی قیادت کی کشمکش کی وجہ کیا ہے؟“ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 25 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری کے مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

”حور کیا کوئی الگ مخلوق ہے؟“

محمد حسن الیاس صاحب نے اپنے اس مضمون میں حور کے بارے میں پائے جانے والے

روایتی تصور کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مطابق حور کوئی الگ یا ماورائی مخلوق نہیں، بلکہ جنت میں داخل ہونے والی نیک، صالح اور پاکیزہ خواتین کا صفاتی ذکر ہے، جنھیں ایک نئی تخلیقی شان اور پاکیزگی کے ساتھ دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ حور کا مفہوم جنت کی روحانی اور جسمانی ہم آہنگی کی علامت ہے، نہ کہ کسی اجنبی مخلوق کا تصور۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے مئی 2025ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

شہزاد سلیم صاحب 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں اب تک کے زیر بحث آنے والے تمام موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''موت کی سزا'' کا خلاصہ بیان کیا۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں وہ لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف

ضرورتوں کے تحت متعدد فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

شہزاد سلیم صاحب غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں تاکہ انگریزی جاننے والے حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ مئی 2025ء میں انھوں نے سورۂ مائدہ کی آیات 12 تا 67 کا انگریزی زبان میں درس دیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔